Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1969

سچے موتی

رسول اللہؐ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز بتاؤں جو نماز
روزہ۔ اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے۔

صحابہؓ نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا تو حضورؐ نے

باہمی تعلقات کا

شائع کردہ ادارہ

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes ? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves careful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs. 25.00 Paper back - Rs. 16.

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E

25 - B, G

(2) MA

Ch

معراجِ انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن - خود قرآن کے آئینے میں

حُسنِ سیرت کی رعنائیاں - خالقِ حُسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں۔
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے۔
- غیر مُسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب۔
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالت مآبؐ میں۔

ایک انقلاب انگیز تصنیف ۔ ایک عہد آفریں کوشش ۔ عِشق و خرد کا حسین امتزاج ۔

بڑا سائز ۔ ضخامت قریب پانچسو صفحات ۔ کاغذ نہایت اعلیٰ ۔ جلد مضبوط ۔ گرد پوش جاذب نگاہ

قیمت: بیس روپے RS, 20/-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

مکتبہ دین و دانش - چوک اُردو بازار - لاہور

لاہور سے

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات

حاصل کرنے یا منگانے کا پتہ:

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
پاکستان : ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

بدل اشتراک
سالانہ ـــــ پاکستان ـــــ دس روپے
سالانہ ـــــ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے
سالانہ ـــــ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط وکتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

جلد (۲۲)	مئی ۱۹۶۹ء	نمبر (۵)

فہرست

۱۔ لمعات ـــــ ۲
۲۔ اقبالؒ اور مزدور ـــــ (حیات النبی رضوی صاحب) ـــــ ۱۵
۳۔ استعمار کا عالمی کردار ۲ ـــــ (خورشید عالم صاحب) ـــــ ۲۲
۴۔ سوشلزم۔ اسلامی سوشلزم اور اسلام۔ ـــــ ۳۳
۵۔ جماعتِ اسلامی اور علماء ـــــ (شاہد عادل) ـــــ ۴۹
۶۔ نقد و نظر ـــــ ۷۹

ایڈیٹر۔ محمد خلیل ناشد، سراج الحق، مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف، مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تاریخ پاکستان میں اگر کوئی چیز بقائے دوام کی مستحق ہے تو وہ ہماری افواج کا قابلِ فخر کردار اور موجب صدرشک کارنامے ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت، بھارتی سورماؤں نے جو کچھ ہمارے بے دست وپا، نہتے اور خانماں خراب مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ کیا، اس کے زخم سینۂ ملت سے کبھی مندمل نہیں ہو سکتے۔ اُسوقت ابھی افواج کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ لیکن بایں ہمہ، ایک چھاپا ماجوان رِستے ہوئے ناسوروں کے لئے تریاق کا کام دے رہا تھا اور وہ تھا، "بلوچ رجمنٹ" کا نام۔ معلوم اس رجمنٹ کے جیالے نوجوان کہاں سے تائید غیبی بن کر آگئے کہ ان کے سہارے یہ درماندہ قافلے منزلِ مراد تک پہنچنے شروع ہو گئے۔ "بلوچ رجمنٹ" کا نام آج تک امن وسکون کی ضمانت کے طور پر ہمارے گھروں میں لیا جاتا ہے۔

پھر ۱۹۵۸ء میں، جب ملک کے نظم ونسق کی کشتی بُری طرح گرداب میں پھنس چکی تھی، انہی افواج نے اسے آکر سنبھالا دیا۔ اور اسے بحفاظت ساحل تک لے آئیں۔ ازاں بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ میں، یوں کہیئے کہ انہوں نے پاکستان کو ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ ورنہ ہندوؤں کے عزائم تو بالکل واضح تھے۔ اب پھر ۱۹۵۸ء جیسے حالات پیدا ہو چکے تھے۔ بلکہ ان سے بھی بدتر۔ کہ ہمارے ان قابلِ فخر جیوشں و عساکر کا احساسِ ذمہ داری بروئے کار آیا اور ان کے دست وبازو نے اس ڈوبتی نیا کو پھر سے بھنور سے نکال لیا۔ ہماری افواج کے یہی وہ درخشندہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے ملت کے دل میں ان کا احترام بڑھتا چلا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کے عزائم میں برکت عطا فرمائے اور یہ زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیاب وکامران رہیں کہ ان کے استحکام و سالمیت میں، پاکستان کے استحکام اور سالمیت کا راز مضمر ہے۔

گذشتہ دنوں، ملک جن ہنگاموں کی نذر ہو رہا تھا، ان کی وجہ سے فضا ایسی پیدا ہو گئی تھی جس میں کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اب جبکہ فضا میں سکون پیدا ہو گیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں قلب ودماغ کی پوری طمانیت کے ساتھ (مل بیٹھ کر) سوچنا چاہیئے کہ ہمارے

ساتھ ایسا کیوں ہوا اور وہ کون سے عناصر اور اسباب تھے جن کی وجہ سے ہمیں اندرونِ خانہ اس قدر تباہیوں سے دوچار اور بیرونی ممالک کی نگاہوں میں ایسا ذلیل و خوار ہونا پڑا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مارشل لاء کوئی بچوں کا کھیل نہیں کہ جس وقت قوم کا مزاج بگڑا، اس سے جی بہلا لیا۔ مارشل لاء (یعنی ملک کے نظم و نسق میں فوجی مداخلت) کو تو یوں سمجھئے جیسے سرسام کا علاج مریض کی فصد کھولنے سے کیا جائے۔ یہ علاج ' مریض کو بچانے کی آخری تدبیر ہوتی ہے جسے انتہائی ہنگامی حالات ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسے قومی زندگی کا معمول نہیں بنایا جا سکتا۔ نہ ہی سپاہ کو مستقل طور پر ملک کا نظم و نسق سنبھالنے میں مصروف رکھا جا سکتا ہے۔ اگر فوج ان امور میں جذب ہو جائے تو ملک کی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا — بالخصوص اس ملک کی سرحدوں کی حفاظت جس کی تاک میں دشمن ہر وقت مستعد بیٹھا ہے۔ ہمیں نہایت ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جن سے بارِ دگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں۔ آیئے ہم ان اسباب و علل پر ایک ایک کر کے غور کریں جو ہمیں کشاں کشاں تباہی کے جہنم کے کنارے تک لے آئے تھے۔

(۱)

سالِ گزشتہ "دہ سالہ جشن" کی تقاریب پر ملک کی ترقی کے مظاہر کو جس انداز سے قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس دس سال کے عرصہ میں ملک نے جس قدر ترقی کی ہے اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ملک میں انواع و اقسام کی صنعتوں کے حامل بڑے بڑے کارخانے نصب ہو گئے۔ حدودِ مملکت کے طول و عرض میں سڑکوں کے جال بچھ گئے۔ ریلوں کی رفتار اور تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ سندھ طاس کے سلسلہ میں آب پاشی اور آب رسانی کا جو جدید نظام وجود میں لایا گیا، عام حالات میں اسے باور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ملک کی زرعی پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ہمارے نزدیک ہی نہیں، بیرونی ممالک کے مبصرین کے نزدیک بھی قابلِ رشک اور واجب التسلیم ہے۔ یہاں وہاں جس قدر طویل و عریض و عمیق ڈیم تعمیر کئے گئے، وہ عہدِ سلیمانی کے جناتی کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر عہد آفریں کارہائے نمایاں ایسے ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن

ان تمام حیرت افزا کارناموں کے باوجود قوم کی پستی کی جو حالت ہمارے سامنے آئی ہے وہ بھی کچھ کم تحیر انگیز نہیں۔ ہم نے ملک میں جس قدر خلفشار پیدا کیا اور اس خلفشار میں جس قدر شرمناک مظاہرے سامنے آئے (وہ دشمنان نوبت بڑی چیز ہے)، دنیا کی کسی مہذب قوم کے شایانِ شان نہیں ہو سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ

ہے کہ اس دس سالہ ترقی کے تصور سے جس قدر ہمارا سر اونچا ہوا تھا، قوم کی اس قدر تاسف انگیز پستی کو دیکھ کر اتنی ہی ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ تفصیل میں جائیے تو اس کے متعدد اسباب و علل گنائے جا سکتے ہیں، لیکن اختصار کو سامنے رکھئے تو بات وہی ہے جسے اقبالؒ نے ان چند الفاظ میں سمٹا دیا تھا کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ہماری ساری کوششیں، سنگ و خشت کا جہان تعمیر کرنے میں صرف ہوئیں۔ لیکن ہم نے "افکارِ تازہ" کی تخلیق کے لئے، ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ ہم نے پہاڑوں کے سینے چیر دیئے، زمین کے عضلات کو شق کر دیا، ہم نے آسمان کی بجلیوں کو تابعِ تسخیر کر لیا۔ دریاؤں کو لگام دے کر ان کے رخ موڑ دیئے۔ غرضیکہ ہم نے خارجی دنیا کے نقشے بدلنے کے لئے بہت کچھ کیا۔ لیکن اپنی داخلی دنیا کی طرف کبھی جھانک کر دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ — إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) قوموں کی حالت میں تبدیلی، ان کی نفسیاتی کیفیت میں تبدیلی کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم نے قوم کی نفسیات میں تبدیلی کے لئے کچھ نہ کیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہم نے بصد حسرت و یاس دیکھا کہ ہمارے ہاں ساری قوم میں (قرآن کے الفاظ میں) ایک بھی "رجلٌ رشید" نہیں تھا۔ ملک بھر میں کوئی ایسی قد آور شخصیت نظر نہیں آتی تھی جس کا احترام پوری کی پوری قوم کرے۔ کوئی ایسا بلند و بالا انسان نہیں تھا جس کی حیثیت ایک بزرگ خاندان کی سی ہو۔ ہم نے دیکھا کہ جنہیں ہم اپنے ہاں کے "بڑے لوگ" کہتے ہیں، وہ اسی طرح بڑے بن گئے ہیں جس طرح بڑے بھائی کے مر جانے سے چھوٹا بھائی از خود بڑا ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے میرِ کارواں کی خصوصیات کے متعلق کہا تھا کہ

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ہم نے دیدۂ عبرت سے اس تلخ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پایا کہ اس کاروانِ ملت میں کوئی ایک شخصیت بھی ایسی نہیں تھی جس میں میرِ کارواں بننے کی صلاحیت ہو۔ نتیجہ اس کا یہ کہ افرادِ کارواں، ناقۂ بے زمام کی طرح آوارہ پھرتے رہے اور کہیں سے کوئی ایسی آواز نہ اٹھی جو انہیں سوئے قطار لے چلے — یہ قحط الرجال، سرکردگانِ قوم کی دنیا میں تھا۔ جہاں تک نسلِ نو کا تعلق ہے، وہ ایک خون بیابانی تھا جو کسی نظم و ضبط کا پابند نہیں تھا۔ یہ اس سے پہلے الٰہ دین کے افسانوی جن کی طرح بوتل میں بند تھا۔ قوم کے

نام نہاد رہنماؤں نے، محض اپنی مقصد براری کے لئے، اس بوتل کا کارک کھول دیا، تو یہ باہر نکل آیا۔ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بند کرنا کسی کے بس میں نہ رہا۔ اس کے بعد خود "الہ دین" حیران کھڑا تھا کہ اس کا کیا کروں؟ مہینوں تک یہ "بہی خواہانِ ملت" تشدد کی آگ کو بھڑکاتے رہے کیونکہ اس وقت اس کا رُخ فریقِ مخالف کی طرف تھا۔ اس کے بعد جب اس کا رُخ خود اپنی پارٹیوں کی طرف مُڑا تو یہ چیخ چیخ کر پکارنے لگے کہ تشدد بند کرو لیکن اب ان کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ یہ ہوتا ہے سرپھری قوم کے جن کو بوتل سے نکالنے کا نتیجہ۔ یعنی یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو سنگ و خشت کی تراش خراش کو ترقی سمجھ لیتی ہے اور آدمیوں کو انسان بنانے کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ اقبال نے جو کچھ بڑے پیمانے پر یورپ کے متعلق کہا تھا، وہی کچھ چھوٹے پیمانے پر ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اگر ہم اپنے جہانِ سنگ و خشت کو قرآنی اقدار کے قالب میں ڈھالتے اور اپنی نئی نسل کی تعلیم کا صحیح انتظام کر لیتے تو یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔

(۱)

(۲)

قرآن کریم نے کہا تھا وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ۔ (۱۶/۹۲)
دیکھنا! کہیں تمہاری حالت اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے دن بھر انتہائی محنت اور شفقت سے سوت کاتا اور پھر شام کو اسے اپنے ہی ہاتھوں بکھیر کر رکھ دیا۔ گزشتہ ہنگاموں سے ہم نے دیکھا کہ ہماری حالت بعینہٖ اس بڑھیا کی سی ہو چکی ہے۔ ہماری اُبھرنے والی نسل، اپنے ہی ہاتھوں کی تیار کردہ ملی متاع کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی ہے۔ قومی عمارتیں ڈھائی جا رہی ہیں۔ مکانات نذرِ آتش کئے جا رہے ہیں، کارخانے تباہ کئے جا رہے ہیں۔ تجارت گاہیں لوٹی جا رہی ہیں۔ سڑکیں توڑی جا رہی ہیں۔ ریلیں پھوڑی جا رہی ہیں۔ درسگاہیں بند ہیں۔ جو کھلتی ہیں ان کا تہس نہس کر دیا جاتا ہے ـــــ یہ سب کچھ انہی کے ہاتھوں ہو رہا تھا جن کا یہ سب کچھ تھا ـــــ اور انہیں کوئی اتنا سمجھانے والا نہیں تھا کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی — یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

یہ "چھوٹوں" کا حال تھا۔ جو "بڑے" تھے وہ خیر سے بڑے پیمانے پر اپنے ہاتھوں کے کاتے ہوئے سوت کو بکھیر رہے تھے ۔۔۔ اسلام نے منتشر افرادِ انسانیہ کو ایک ملت کے رشتہ میں پرونے کے لئے ایک محکم اصول عطا کیا تھا اور وہ یہ کہ ملت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ہوتی ہے ۔۔۔ نسل، رنگ، زبان، وطن، کا اشتراک انسانیت کے لئے وجہ جامعیت نہیں بلکہ باعث افتراق ہوتا ہے۔ سرسیدؒ اور اقبالؒ نے صدیوں کے اس بھلائے ہوئے سبق کی یاد دہانی کرائی۔ اور قائداعظمؒ نے، اپنی دس سالہ محنت شاقہ سے، اس جگر لخت لخت کو اکٹھا کرکے، آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم کی تشکیل کی، اور اسی بنا پر اس کے لئے ایک الگ مملکت حاصل کی۔ اس مملکت کے بسنے والے ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کے مدعی ہونے کی بنا پر ایک قوم کے افراد تھے۔ ان میں بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، افغان کی کوئی تمیز و تفریق نہیں تھی۔ یہ سب قطرات، بحرِ ملت میں گم ہوکر بحر بن چکے تھے۔ عملی حیثیت سے مملکت کا ایک مستحکم مرکز قائم کرکے، مشرق و مغرب کی تخصیص کو ختم کرنے اور مغربی پاکستان میں صوبوں کی وحدت سے، سندھی، افغانی وغیرہ کی تفریق کو مٹانے کی طرف مستحسن قدم اٹھایا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہمارے ہی خواہانِ قوم اُٹھے کہ وحدتِ ملی کی طرف لے جانے والے ان اقدامات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر، اسی ۔۔۔ یا افغانی وہ تورانی ۔۔۔ کی عصبیتِ جاہلیہ کو از سرِ نو زندہ اور روشن کردیا جائے ۔۔۔ علاقائی خود مختاری سے مرکز کو قریب قریب معدوم کردیا جائے، اور وحدتِ مغربی پاکستان کو ختم کرکے، ملک کو چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے اور یوں جسدِ ملت کی بوٹی بوٹی کرکے اردگرد منڈلانے والی چیلوں اور گدھوں کو دعوت دی جائے کہ وہ ان بوٹیوں کو اُچک کر لے جائیں ۔۔۔ کتنی عظیم تھی یہ خدمت قوم اور ملک کی جسے یہ راہ نمایانِ ملت سر انجام دے رہے تھے اور کیا مقدس تھا یہ جہاد جس میں یہ ہمدردانِ اسلام مصروف تھے! ۔۔۔ قومیں اپنے اختلافات کو مٹا کر اتحاد و ائتلاف کی طرف مائل ہو رہی ہیں اور یہ ۔۔۔ دنیا کو اتحاد و ائتلاف کا سبق دینے والے ۔۔۔ اپنے بچے کھچے اتحاد کو بھی نذرِ افتراق کر رہے تھے۔ سچ کہا تھا کبھی حکیم الامت نے کہ ؎

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

یہ حضرات کر تو یہ کچھ رہے تھے اور پھر متمنی تھے کہ قوم ان کے لئے زندہ باد کے نعرے بلند کرے۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

لیکن اس باب میں ہمیں سابقہ اربابِ اقتدار سے بھی سخت شکایت ہے کہ انہوں نے مستحکم مرکز اور وحدتِ مغربی پاکستان کو محض انتظامی حد تک محدود رکھا اور عملی اقدامات ایسے کئے جن سے سابقہ صوبائی

بلکہ نسلی اختلافات بدستور قائم رہیں۔ وحدتِ قومی کو برقرار رکھنے (بلکہ مستحکم بنانے) کے لئے ضروری تھا کہ نظریۂ پاکستان کو (جو درحقیقت قرآن کی مستقل اقدار ہی کا دوسرا نام ہے) اس قدر عام کیا جاتا کہ ساری فضا اس سے معمور ہو جاتی۔ کالجوں اور اسکولوں میں، مکتبوں اور مدرسوں میں' اسے نصابِ تعلیم کی بنیاد قرار دیا جاتا۔ مساجد کے منبروں سے اور جلسہ گاہ کی اسٹیجوں سے اس کا چرچا عام کیا جاتا۔ گلی اور کوچوں، محلّوں اور گھروں میں مسلسل اس کا تذکرہ ہوتا۔ تعلیم گاہوں میں داخلے اور حکومت کی اسامیوں پر تقرر کے لئے معیار' ملّتِ پاکستانیہ کا فرد اور جوہرِ ذاتی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ "مسلمان" کے علاوہ ہر تمیز و تخصیص کو مٹانے کے لئے عملی اور مثالی اقدامات کئے جاتے۔ اس طرح ان منتشر ذرات کو نظریۂ پاکستان کے سیمنٹ سے ایک ایسی محکم چٹان میں تبدیل کر دیا جاتا کہ مخالفت کی ہر پُرآشوب موج اس سے آکر ٹکرائے اور اپنا سر پھوڑ کر خاسر و ناکام لوٹ جائے۔ ہم نے ایسا نہ کیا اور اس کا نتیجہ شکست و ریخت کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا۔

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

(۰)

(۳)

قرآنِ کریم نے ملّت کی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے دو بنیادی اصول دیئے تھے۔ ایک یہ کہ تَتَفَكَّرُوا۔ اور دوسرے یہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ تتفکّروا سے مراد یہ ہے کہ اپنے جذبات کو ہمیشہ کنٹرول میں رکھو اور معاملہ پیشِ نظر پر دل و دماغ کے کامل سکون کے ساتھ' غور و فکر کرو۔ اس کے ہر پہلو کے متعلق، جذبات سے بلند ہو کر' سوچ بچار کرو۔ اور امرھم شوریٰ بینھم سے مطلب یہ ہے کہ اجتماعی معاملات کے فیصلے افراد از خود نہ کرنے بیٹھ جائیں۔ بلکہ امّت' باہمی مشاورت سے اس قسم کے فیصلے کرے۔ قرآنِ کریم نے ہمیں یہ سبق دیا تھا لیکن ہم جب اپنی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو یہ تلخ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ ایسے اہم اور بنیادی اصولوں کو فراموش کر دیا بلکہ عملاً ہمیشہ ان کے خلاف کیا۔ ہم نے تحمّل، بردباری (TOLERANCE)۔ فریقِ مقابل کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش، ٹھنڈے دل سے غور و فکر کی روش' کو بالائے طاق رکھ کر' شعلہ مزاجی اور آتش نفسی کو اپنا شعار بنا لیا۔ ذرا سی بات ہمارے مزاج کے خلاف ہوئی اور ہم آپے سے باہر ہو گئے۔ یونہی ہم سے کسی نے اختلاف کیا اور ہمارے جذبات شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھے اور ہم پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگ گئے۔ صدیوں کی ممارست سے یہ روش اب (گویا) ہمارا قومی مزاج بن چکی ہے ـــــ اور تأسف بالائے تأسف کہ بجائے اسکے کہ ہم اس پر نادم ہوں' اسے جرأت اور بے باکی کا غلط نقاب اوڑھا کر' اس پر فخر کرنے لگ گئے ہیں۔

جہاں تک "مشاورت" کا تعلق ہے، ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ غلط اور نہایت مضرت رساں تصور عام ہو چکا ہے کہ ملت کے اجتماعی امور سے متعلق کسی معاملہ میں کسی شخص کو کوئی اختلاف ہو تو اسے اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اس کے خلاف علمِ بغاوت کھڑا کر دے۔ اس روش کا نتیجہ جس قسم کی انارکی ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

گزشتہ ہنگاموں میں یہ دونوں شکلیں ہمارے سامنے آئیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں، انتخابات کی جو شکل اور صدارتی طرزِ حکومت کا جو انداز مقرر کیا گیا تھا، بعض حضرات کو اس سے اختلاف ہوا۔ اور انہوں نے اس میں تبدیلی کرانا چاہی۔ آئین میں تبدیلی کرانے کا آئینی اور جمہوری طریقہ خود آئین میں موجود تھا۔ ان حضرات کو چاہیئے تھا کہ اس تبدیلی کے لئے وہی طریق اختیار کرتے۔ اگر وہ سمجھتے کہ اس سے انہیں کامیابی نہیں ہو سکتی تو ان کے لئے دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے نقطۂ خیال کو پُرامن طریق سے عام کر کے، رائے عامہ کو اپنے حق میں اس طرح ہم نوا کرتے کہ آئندہ الیکشن میں، انہیں دو تہائی اکثریت کے ساتھ کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ خود جمہوری طریق سے آئین میں تبدیلی کر لیتے۔ لیکن انہوں نے نہ وہ شکل اختیار کی نہ یہ؛ بلکہ خود ہی قوم کے لیڈر بن کر، ملک میں ہنگامے برپا کرانے شروع کر دیئے اور اس کا نام "تحریکِ جمہوریت" رکھ کر دنیا کو (یا اپنے آپ کو) اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ ہم نے تبدیلی آئین کے لئے جمہوری طریق اختیار کیا ہے۔ ان حضرات سے پوچھیئے کہ آپ کے پاس اس کی سند (اتھارٹی) کیا تھی کہ آپ ملک کی بارہ کروڑ آبادی کے نمائندے ہیں۔ اور جو کچھ آپ کر رہے ہیں، آبادی کی اکثریت اس سے متفق ہے؟ کہا جائے گا کہ ان ہنگامہ آرائیوں میں "عوام" ان کے ساتھ تھے۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ ہمارے ہاں تو ہنوز سیاسی شعور اتنا بیدار ہی نہیں۔ جن ملکوں میں یہ شعور کافی حد تک عام ہو چکا ہے، وہاں کے عوام کی بھی یہ حالت ہے کہ جو شخص یا گروہ ان کے سطحی جذبات کو مشتعل کر دے، عوام اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اپنے پیچھے لگا لینے کا نام "جمہوریت" رکھ لینا، جمہوریت کا مذاق اڑانا ہے۔ عوام کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اس سلسلہ میں ہمیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحوم) کا ایک مثالی واقعہ یاد آ گیا جسے وہ اکثر خود دہرایا کرتے تھے۔ (غالباً) نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں، مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے تھے ـــــ ایک گروہ اس کے حق میں تھا اور دوسرا اس کے خلاف ـــــ بخاری صاحب جس گروہ سے متعلق تھے، اس کے خلاف شہر میں خاصا پراپیگنڈا ہو رہا تھا۔ موچی دروازہ کے باہر ایک جلسۂ عام منعقد ہوا۔ اور اس میں شاہ صاحب نے تقریر شروع کی ـــــ شاہ صاحب کی جادو بیانی بے مثال تھی۔ انہوں نے آدھی رات تک اس رپورٹ کے حق میں تقریر کی اور سامعین سے پوچھا کہ کیا نہیں یہ رپورٹ

منظور ہے۔ انہوں نے بیک زبان پکارا کہ ہاں منظور ہے۔ پھر شاہ صاحب نے پلٹا لیا اور اپنے مخصوص انداز میں، اس رپورٹ کی مخالفت شروع کی اور سامعین کے جذبات کو انتہائی شدت تک پہنچا کر ان سے پوچھا کہ کیا تم اس ملعون رپورٹ کو مسترد کرتے ہو؟ انہوں نے اسی زبان سے کہا کہ ہاں مسترد کرتے ہیں۔

—— اس کے بعد انہوں نے جو کچھ "عوام" سے کہا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

یہ ہوتی ہے عوام کی تائید یا تردید کی کیفیت۔ لہٰذا کسی کا خود ہی عوام کا نمائندہ بن جانا اور اس کے بعد ان کے سطحی جذبات کو بھڑکا کر انہیں اپنے پیچھے لگا لینا، اور اس کا نام جمہوری طریق رکھ لینا، ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے! ان ہنگاموں اور شورشوں کا سارا دارومدار اخبارات کے پراپیگنڈے پر تھا۔ اگر اخبارات چار دن کے لئے بھی، پراپیگنڈہ کے بجائے، واقعاتی رپورٹیں، معروضی طریق پر (OBJECTIVELY) شائع کرنے لگ جاتے، تو اس "جمہوریت" اور "عوامی تحریک" کی قلعی کھل جاتی۔

پھر قیامت یہ کہ یہ تمام حضرات، ان ہنگامہ آرائیوں میں، اسلام کا نام بھی ساتھ کے ساتھ لیتے جاتے تھے۔ ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس اسلام نے "تفکر اور مشاورت" کا اصول دیا تھا، کیا اس اسلام کی رُو سے، یہ طریق کار کسی طرح بھی جائز قرار پا سکتا تھا؟ ۱۹۶۲ء کے آئین کی اکثر دفعات سے ہمیں خود اختلاف تھا اور ہم نے اکثر ان پر تنقید بھی کی۔ نظم و نسق حکومت میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ہم نے ان کا بھی سختی سے مواخذہ کیا۔ اور ان کی اصلاح کے لئے مسلسل و متواتر لکھتے رہے۔ ہم نے ارباب حکومت کو ان کے ہر غلط قدم پر ٹوکا۔ لیکن ہم نے ہنگامہ آرائیوں کو کبھی مستحسن قرار نہیں دیا کہ قرآن اس طریق کار کی اجازت ہی نہیں دیتا —— قطع نظر ان تمام امور کے، یہ حضرات اتنا بتائیں کہ اگر کل کو آپ برسر اقتدار آ جائیں۔ اور آپ کے کسی فیصلہ سے، آپ کے فریق مقابل کو اختلاف ہو، تو کیا آپ پسند کریں گے کہ وہ، اپنی بات منوانے کے لئے اس قسم کا طریق اختیار کر لے جو طریق آپ نے اختیار کیا تھا؟ سوچئے کہ جس روش کی طرح آپ نے ڈال دی ہے، وہ اگر قوم میں جاری رہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو! وہ تو بھلا ہو ہماری فوج کے سربراہوں کا کہ انہوں نے بروقت آکر اس آگ کو بجھا دیا، ورنہ (نظر یہ آتا تھا کہ) آئین میں تبدیلی کراتے کراتے ہم (خاکم بدہن) اس ملک ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اور اب بھی ملک کا جس قدر نقصان ہو چکا ہے، اس کی تلافی کے لئے معلوم کتنا عرصہ لگ جائے —— مالی نقصان اور ساکھ کے دھکے کے علاوہ، تعلیم کے میدان میں ہم نے جو کچھ کھویا ہے، اس کی تو تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔

—— اے کاش! ان "بہی خواہانِ پاکستان" کو کم از کم پاکستان کی اس بننے والی قوم کی حالت ہی پر ترس آ جاتا! لیکن

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

ان "مجاہدینِ کرام" کو تو اپنی بات منوانے سے غرض تھی۔ ملک اور قوم جائے جہنم میں۔

———(۰)———

(۴)

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ملک میں ہنگامے برپا کرانے والوں کو خام مسالہ ملتا کہاں سے ہے؟ اس کا جواب ایسا آسان ہے کہ اسے تلاش کرنے کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ خام مسالہ ہوتا ہے ملک کی وہ کثیر آبادی جو معاشی بدحالیوں میں مبتلا ہوتی ہے۔ وہ محنت کش جنہیں ہزار جتن کے باوجود نہ پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے، نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ جن کے بچے زندگی کی عام ضروریات سے محرومی کی وجہ سے ترس ترس کر دن کاٹتے اور بلک بلک کر مر جاتے ہیں۔ یا وہ طالب علم، جنہیں نظر آتا ہے کہ پندرہ بیس برس کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کے بعد، انہیں نانِ شبینہ تک کے لئے در بدر کی خاک چھاننی اور ہر آستانے سے ٹھوکریں کھانی پڑیں گی — یہ ہے وہ محروم و محتاج طبقہ جو فسادات کی آگ کا ایندھن بنتا اور ہنگاموں کے جھکڑ کو دعوت دینے کے لئے خلا کا کام دیتا ہے۔ ہم نے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گزارش کیا — اور بہ تکرار و اصرار گزارش کیا۔ بصد الحاح و زاری گزارش کیا۔ دل کے پورے درد اور آواز کی پوری شدت کے ساتھ گزارش کیا۔ کہ ملک کو ان تباہیوں سے بچانے کا ایک اور صرف ایک طریق ہے۔ اور وہ ہے موجودہ معاشی نظام کی جگہ قرآنی نظامِ معیشت کی ترویج۔ وہ نظامِ معیشت جس میں —

(۱) تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوتی ہے۔

(۲) اس مقصد کے حصول کے لئے وسائلِ پیداوار ملّت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں۔

(۳) نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے اور نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کے مواقع — اور

(۴) اس کے ساتھ ہی ملک میں قرآنی اقدار اس طرح رائج کی جاتی ہیں کہ اس سے افرادِ مملکت میں داخلی تبدیلی پیدا ہوتی جائے۔ یاد رکھیئے۔ افرادِ قوم میں سیرت کی پختگی کے بغیر وسائلِ رزق کا قومیانہ غلامی کی بدترین شکل پیدا کر دیتا ہے۔

اس لئے قرآنی نظام میں، معاشی انقلاب اور سیرت و کردار میں تبدیلی ساتھ ساتھ چلتی ہے اور یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جو قرآن کے معاشی نظام کو سوشلزم سے متمیز کرتی ہے۔

قرآن کریم نے امت (بلکہ نوعِ انسان) کے لئے یہی معاشی نظام تجویز کیا تھا۔ اسی میں انسان کی مشکلات کا حل پوشیدہ تھا۔ لیکن ہمارے ہاں ایک مشکل اور ہے ـــــ اور یہی مشکل درحقیقت، ہمارے خلفشار اور انتشار کا بنیادی سبب بھی ہے۔ یہ اجمال ذرا تفصیل طلب بھی ہے اور گہری توجہ کا مستحق بھی۔

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ یعنی اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی رائج کیا جائے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے جو نظامِ زندگی تجویز کیا تھا وہ متعین، واضح اور روشن تھا اور خدا کی کتاب کے اندر ملفوف ہونے کی وجہ سے محفوظ اور غیر متبدل۔ لیکن، بدقسمتی سے اب یہ اصطلاح ایسی مبہم اور غیر متعین بن چکی ہے کہ ہر شخص کا اسلام کا تصور اپنا ہے۔ اور اس کی تعبیر کو ملک کی ایک سیاسی جماعت نے (کلیسا کی طرح) اپنی اجارہ داری قرار دے رکھا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جو چیز اس جماعت کے مفاد اور مصلحت کے مطابق ہو، اسے وہ اسلامی قرار دے دیتی ہے اور جس سے اس کے مفاد پر زد پڑتی ہو، اس پر غیر اسلامی کا لیبل لگا کر اس کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتی ہے۔ ان کا اسلام ان کی مصلحتوں کے مطابق آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس بیس سال کے عرصہ میں اسلام کے کئی مختلف ایڈیشن ان کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی جماعتوں کا اپنا ذریعہ آمدنی کچھ نہیں ہوتا اس لئے یہ ہمیشہ سرمایہ داروں کے سہارے جیتی اور پنپتی ہیں۔ چونکہ قرآن کا معاشی نظام سرمایہ داری کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے اس لئے مذکورہ بالا جماعت کی طرف سے اس کی مخالفت ضروری تھی۔ اس نے اس کی مخالفت کی ـــــ اور چونکہ اس جماعت کے "اسلام" کی رُو سے، زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ تک بولنا جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے، اس لئے اس مخالفت میں اس نے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا۔ اس باب میں سب سے مؤثر حربہ یہ تھا کہ یہ مشہور کر دیا جائے کہ یہ معاشی نظام کمیونزم ہے اور چونکہ کمیونزم میں خدا، رسول، وحی، آخرت سے انکار ہوتا ہے، اس لئے یہ نظام اسلام کی یکسر نقیض ہے۔ اس کی اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نظامِ سرمایہ داری اور بھی مضبوط ..... اور اس کی پیدا کردہ خرابیاں، شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئیں ـــــ دولت سمٹ کر چند گھرانوں میں مرکوز ہو گئی اور امیر اور غریب میں بُعد، ناقابلِ عبور حد تک بڑھ گیا۔ اس سے ایک طرف افراطِ زر کا پیدا کردہ سرسام جنون کی حد تک پہنچ گیا اور دوسری طرف احتیاج اور افلاس کے پیدا کردہ عیوب، جذام کی شکل اختیار کر گئے ـــــ بھوک اور احتیاج کے ستائے ہوئے یہی وہ انسان تھے جو سیاسی طالع آزماؤں کے مقاصد کے بروئے کار لانے کے لئے نہایت آسانی سے آلۂ کار بن گئے۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ جب تک ان کی بھوک

اور احتیاج کا معقول اور تسلی بخش انتظام نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح دوسروں کا آلۂ کار بنتے رہیں گے اور ملک میں مستقل امن کی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ یہاں قرآن کے تجویز کردہ نظامِ معاشی کا آغاز کر کے، اسے بتدریج تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ یہاں وہ خلاء پیدا نہ ہو جائے جو کمیونزم کے جھکڑ کو آواز دے کر بلا لیا کرتا ہے۔ خدا اس مملکت کو اس خطرہ سے محفوظ رکھے۔

(۰)

(۵)

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے یہ اعلان کیا ہے کہ ان کے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ ملک میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں انتخابات پُرامن اور جائز طریق سے تکمیل تک پہنچ جائیں۔ ان انتخابات کی رُو سے نمائندگانِ قوم کی جو مجلس مرتب ہو، وہ ملک کے آئین میں مناسب تبدیلیاں کرے۔ یہ مقصد جس قدر مبارک، اور یہ تجویز جس قدر مسعود ہے، اس کے متعلق دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لئے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مستحقِ تبریک و تحسین ہیں۔ لیکن آئین سازی (اور اس کے بعد وضع کردہ قوانین) کے سلسلہ میں جو بنیادی دشواری پیش آنے والی ہے ضروری ہے کہ اس کا کوئی حل پہلے سے تجویز کر لیا جائے۔ ورنہ جو کچھ یہاں گزشتہ بیس سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے اسکا اعادہ پھر ہو جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے۔

(۱) پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا ہے کہ یہاں اسلامی آئین رائج اور اسلامی قوانین نافذ ہوں۔

(۲) اسلامی مملکت، اسلامی نظام، اسلامی آئین، حتیٰ کہ اسلامی قوانین وغیرہ اصطلاحات ایسی مبہم بنا دی گئی ہیں کہ ان کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں آتا۔ ان کا مفہوم متعین کرنے کی اجارہ داری ایک خاص جماعت نے اپنے لئے مختص کر رکھی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جو آئین یا قانون ان لوگوں کی مرضی کے مطابق نہ ہو، یہ اُسے غیر اسلامی قرار دے کر پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہاں کی آبادی کی اکثریت مذہب پرست لیکن اَن پڑھ اور جذباتی ہے، اس لئے، اس قسم کے پراپیگنڈہ کی رُو سے، یہاں ہر وقت شورش برپا کرائی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مملکتِ پاکستان کو وجود میں آئے تیس سال سے زاید کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن اسے ابھی تک نہ کوئی محکم آئین مل سکا ہے اور نہ ہی کوئی ضابطہ قوانین مرتب ہو سکا ہے۔ اس مشکل کا حل کیا ہے، اس کے متعلق ہم اُس وقت گزارش کریں گے جب نئے انتخابات کے بعد، جدید پارلیمان وجود میں آ جائے گی۔ اس وقت ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ کی خدمت میں عرض کر دینگے کہ وہ اپنی پوری پوری کوشش کریں کہ ملک میں پھر کبھی وہ حالات پیدا نہ ہونے پائیں جن کی وجہ سے ہمیں اس قدر

ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور جن کی روک تھام کے لئے مارشل لاء کا نفاذ ناگزیر ہوگیا۔ اس دوران میں کرنے کا کام یہ ہے کہ پارٹی بازی سے متعلق بحثوں سے اجتناب برت کر، ملک میں نظریۂ پاکستان کو عام کیا جائے۔ پاکستان کی سالمیت اور استحکام۔ یک جہتی اور یک جہتی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ طالب علموں پر اس حقیقت کی اہمیت بیش از پیش واضح کی جائے کہ ان کا اولین مقصد حصولِ تعلیم ہے، اس لئے وہ اپنا وقت اور توانائی اسی مقصد کے حصول کے لئے وقف کردیں اور کسی قیمت پر بھی کسی پارٹی کا آلۂ کار نہ بنیں۔ اور آخری بات یہ کہ ملک میں کسی کی طرف سے کوئی قدم ایسا نہ اُٹھنے پائے جس سے اس کی حفاظت کو کسی قسم کا ضعف پہنچے کہ ہماری اور ہماری آنے والی نسلوں کی زندگی اور عزت و آبرو کا راز اسی کی حفاظت اور سالمیت میں پوشیدہ ہے۔

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

گجرات شہر میں بزمِ طلوعِ اسلام کا قیام

محترم شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ (سول لائنز۔ عزیز بھٹی شہید روڈ گجرات) نے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے اپنے ہم فکر و ہم آہنگ احباب کی معیت میں گجرات شہر میں بزمِ طلوعِ اسلام قائم کر لی ہے۔ ادارہ اس بزم کے قیام کی منظوری دیتے ہوئے محترم شیخ قدرت اللہ صاحب اور اُنکے رفقائے بزم کے لئے دُعاگو ہے کہ نورِ قرآنِ کریم کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے اللہ تعالےٰ اُن کی مساعی جمیلہ میں برکت و استقامت عطا فرمائے۔

گجرات و گردونواح کے احباب مذکورہ بالا پتہ پر رابطہ قائم کریں جہاں ہر جمعہ، بعد از نماز جمعہ اور ہر اتوار بوقت ۹ بجے صبح، محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآنِ کریم (بذریعہ ٹیپ) کا بھی انتظام کر لیا گیا ہے۔

(ناظم)

معذرت

زیرِ نظر شمارہ ماہ مئی کا ہے۔ لیکن اس میں بعض صفحات کے اوپر اپریل ۱۹۶۹ء چھپ گیا ہے۔ قارئین اسکی تصحیح فرمالیں۔ شکریہ! (ناظم)

ادارہ طلوع اسلام کی تازہ پیشکش!

طاہرہ کے نام خطوط

ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں اسلام کے متعلق جو سوالات پیدا ہوتے ہیں یا زندگی کے جن مسائل سے انہیں دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا اطمینان بخش حل پیش کرنے کے لئے پرویز صاحب نے خطوط کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ "سلیم کے نام خطوط" میں مردوں سے متعلق مسائل کا حل دیا گیا تھا۔ اور "طاہرہ کے نام خطوط" میں عورتوں سے متعلق مسائل کا حل۔

طاہرہ کے نام خطوط

کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں دو جلدوں میں شائع ہوا تھا جو مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا اور اسکی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اس کا

تازہ ایڈیشن

مصنف کی نظر ثانی کے بعد ایک ہی جلد میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بارہ خطوط کے علاوہ عورتوں سے متعلق قرآنی احکام بھی یکجا دے دیئے گئے ہیں اور آخری باب میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی۔

کتاب سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ کتابت طباعت، روشن۔ ضخامت قریب ساڑھے تین سو صفحات۔ مجلد۔ گرد پوش بہار آفریں۔ ——— قیمت۔ چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(نوٹ) پیشگی خریدار حضرات جلدی اطلاع دیں تاکہ انہیں سب سے پہلے کتاب بھیجی جا سکے۔

ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

اقبالؒ اور مزدُور

(یوم اقبال منجانب "بزم طلوعِ اسلام" کراچی منعقدہ ۱۲ اپریل ۱۹۶۸ء میں پڑھا گیا)

اس سے قبل کہ موضوعِ بحث کا تفصیلی جائزہ لیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؒ اور انکی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تاکہ مضمونِ متعلقہ کے بارے میں اقبالؒ کے افکار و نظریات بہتر طور پر واضح ہو سکیں اور اُن میں وہی تاثر ہو جو حقیقتاً علامہؒ کا مدعا و مقصد تھا ــــ اقبالؒ کے دور کو عوام کے سیاسی و سماجی اور شعوری انقلاب کی پہلی انگڑائی کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی وہ دور ہے جس میں ہماری شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور جاگیردارانہ دور کا فرسودہ چولہ اتار پھینکا ــــ حالی، سرسید، شبلی وغیرہ اس دور کی نمایاں شخصیات ہیں۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو شدّت سے محسوس کیا تھا۔ اور ان کی تحریرات و تقاریر کا جذبۂ محرکہ مسلمان قوم کو اسکی عظمتِ رفتہ کا یاد دلانا تھا۔ اس فرض کی بجا آوری میں اقبال پیش پیش نظر آتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس قوم نے اپنے محسن کی تعلیمات کو کچھ ایسا دھندلایا کہ آج اقبالؒ کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ مثلاً۔

اقبال کا نصبُ العین فسطائیت سے زیادہ قریب ہے۔

اقبال شخصیت پسند و ماضی پرست تھے۔

اقبال جنگ و جدل اور جبر و تشدّد کے مبلّغ تھے۔

اقبال اشتراکیت کے حامی تھے۔

اقبال اشتراکیت کے مخالف تھے۔

اقبال کا فلسفۂ حیات برگساں و نطشے کا اسلامی ایڈیشن ہے۔

اقبال کا نظریۂ قومیت رینان کے نظریۂ قومیت سے ماخوذ ہے ــــ وغیرہ وغیرہ

اقبالؒ ایک خالص اسلامی مفکر ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا اپنی بصیرتِ قرآنی کی بنیاد پر کہا۔ ان کو سمجھنے کے لئے

پہلے ضروری ہے کہ قرآن کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کو سمجھا جائے۔ نیز ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُنکی نثر کو بھی سامنے رکھا جائے۔ صرف شاعری کو ان کے فلسفے کے سمجھنے کا ذریعہ جان کر اُن کے نقطۂ نگاہ کی تلاش کرنا اپنے آپ کو صدہا الجھنوں کی نذر کرنا ہے۔ کیونکہ ایک شاعر ہزار خوبیوں کے باوجود بعض مقامات پر متضاد خیالات کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حساس شاعر جہاں اپنے نظریات و خیالات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے وہاں کچھ وقتی و لمحاتی احساسات کا پرتو بھی ہزار شعوری کوششوں کے باوجود اس کے کلام میں جگہ حاصل کر جاتا ہے۔ بہرحال علامہ کے پیام کا محور قرآن کریم ہے اور ان کا مخاطب مسلمان!

اقبالؔ کے حقیقی مقام شناس' اور مفکرِ قرآن' جناب پرویز صاحب اپنے طویل مقالے "اقبال اور قرآن" میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انہوں نے اس دور میں جبکہ مسلمان قرآن کریم سے بہت دور جا چکے تھے، اُن کے سامنے قرآنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعید روحیں اپنے مربوطِ ہستی کے تاروں اور اس سازِ نغمۂ الست کے پردوں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگیں جیسے دامنِ کوہسار کی چاندنی رات میں دور سے بانسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔"

(۰)

وہ مردِ دانا جو قرآنِ کریم کا خوشہ چین ہو' اور اپنے تمام تصورات کی بنیاد "اُمّ الکتاب" کو گردانتا ہو' ہو نہیں سکتا کہ تہذیبِ مغرب (اور اُسکے لازمی نتیجہ) نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہو جس میں ایک شخص متعدد محنت کشوں کی محنت کے ماحصل پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ اقبالؔ کے سامنے سورۃ انعام کا یہ حکم واضح تھا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (۶/۱۶۵) یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بانگِ درا کی آخری طویل نظم بعنوان 'طلوعِ اسلام' میں کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت' ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

بانگِ درا کی ایک اور نظم "سرمایہ و محنت" میں نظامِ سرمایہ داری کے خلاف مزدور کو اس طرح خطاب کیا

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزدیوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبالؔ نے جہاں جہاں بندۂ مزدور، دہقان، سرمایہ دار، خواجہ، بندہ یا غلام و آقا کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے اُن کی تہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی نظامِ معیشت اور انسان کے خود وضع کردہ نظامِ سرمایہ داری کے فرق کو سامنے رکھا جائے۔ قرآن کریم، انسان کو صرف محنت کے ماحصل کا حقدار قرار دیتا ہے اور اس بناء پر مزدور و دہقان کو عظیم ترین مقام عطا کرتا ہے جبکہ نظامِ سرمایہ داری میں ایک شخص کو اس بات کی کھلی اجازت ہوتی ہے کہ وہ بغیر ہاتھ ہلائے محض اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر ہزاروں انسانوں کی محنت کو غصب کرتا چلا جائے۔ قرآن حکیم نے اس نکتہ کی وضاحت کے لئے سورۃ النجم میں صاف طور پر کہا ہے کہ — لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ یعنی انسان اس سے زیادہ کا حقدار نہیں ہے جس کے لئے اُس نے محنت کی ہو، نیز سورۃ الاحقاف میں کہا ہے — وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا۔ (۴۶/۱۹) یعنی ہر ایک کے مدارج اُن کے اعمال کے مطابق ہوں گے۔ انہی نظریات کی تائید اقبالؔ کس خوبصورتی سے کر جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

کارخانے کا ہے مالک مردِ ناکردہ کار — عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اُسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

"پیامِ مشرق" میں "مردِ مزدور" کے عنوان میں فرماتے ہیں۔ ؎

بدوشِ زمیں بارِ سرمایہ دار — ندارد گزشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہر وزی از دستِ مُزد — ندانی کہ ایں ہیچ کار است و دُزد

یعنی سرمایہ دار تو زمین کے کاندھے کا فضول بوجھ ہے اور اسے کھانے اور سونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ دنیا کی حقیقی رونق و ترقی مزدور کے ہاتھ سے ہے اور یہ نہ سمجھ کہ کوئی ڈاکو بھی یہ فرض ادا کر سکتا ہے۔

"پیامِ مشرق" ہی کی ایک دوسری نظم "نوائے مزدور" میں نظامِ سرمایہ داری کی افراط و تفریط سے پیدا شدہ مزدور و سرمایہ دار کے معاشی امتیاز کی تصویر انتہائی پُراثر طریق پر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

ز مُزدِ بندہ کرِ پاس پوش و محنت کش — نصیبِ خواجہ ناکردہ کار رختِ حریر

زخوے فشانی من لعل خاتم والی | زاشک کودک من گوہر ستام امیر
زخون من چو زلو فربہی کلیسا را | بزور بازوئے من دست سلطنت ہمہ گیر

زرہزنان چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

دوسری جگہ کہتے ہیں:۔

جہان تست در دست خسے چند | کسان او بہ بند ناکسے چند
ہنر در درمیان کارگاہان | کشد خود را بہ عیش کرگسے چند

یعنی ــــ شکستہ محنت ہو جانے والے اور ٹاٹ پہننے والے مزدور کی سعی سے بیکار و تن آسان سرمایہ دار ریشم کا لباس پہنتا ہے ــــ میں خون پسینہ بہاتا ہوں تو اس سے آقا کی انگشتری کا لعل تیار ہوتا ہے اور میرے بچے کے آنسوؤں سے امیر کے زیور اسپ کا موتی بنتا ہے ــــ کلیسا (یعنی مذہبی حلقہ) میرے خون سے جونک کی طرح موٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور حکومت کا ہاتھ میری قوت بازو سے توانا اور ہمہ گیر ہے ــــ آ کہ چمن کے ڈاکوؤں سے خون لالہ کا انتقام لیں اور محفل غنچہ و گل کی بنیاد کسی نئے انداز پر رکھیں ــــ پروردگار! تیری دنیا چند ذلیل خسیس لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کے معقول و برگزیدہ لوگ نااہلوں کی مفاد پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ــــ کارخانوں میں ایک ہنرمند مزدور خود کو چند گدھوں کے عیش و عشرت کے لئے ہلاک کرتا ہے۔

"بانگ درا" کی نظم "خطاب بہ دہقان" میں یوں مخاطب ہوتے ہیں :؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا | دانا تو کھیتی بھی تو، باراں بھی تو حاصل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو | خوف باطل کیا؟ کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبال کی نگاہ حق شناس نے سرمایہ داری اور اس کے جراثیم خبیثہ کو پوری طرح پہچان لیا تھا اور وہ زندگی بھر اس فتنہ انگیز نظام کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ قدم قدم پر انہوں نے اس کے شر و فساد سے آگاہ کیا اور اس کے مقابلے میں قرآنی حقائق و نظریات کا پرچار کرتے رہے۔ اُن کی دور رس نگاہوں نے "جمہوریت" کے بظاہر خوش آئند لفظ کے پس منظر میں مترفین کے مکروہ چہروں کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے جمہوریت کی مخالفت اُس دور میں کی جب اُس کا دور دورہ و شہرہ تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ روس کے اشتراکی انقلاب کی گرمی رفتار سے

اس معنی میں پُرامید تھے کہ شاید اب دنیا میں ارتکازِ دولت کی روش ختم ہو جائے اور اُس کی جگہ وہ اقدار نافذ ہوں جو قرآن کا مقصود و منتہا ہے۔ قرآن نے سورۂ توبہ میں متنبہ کر دیا تھا کہ ۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (۹/۳۴) ۔ یعنی جو لوگ دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام نہیں کرتے، اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ ان کی اس روش کا انجام الم انگیز تباہی ہوگا۔" اسی خیال کو اقبال نے "خطاب بہ ملّتِ روسیہ" میں یوں نظم کیا ہے۔ ؎

چیست قرآں! خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا
از ربا، آخر چہ می زاید؟ فتن　　کس نداند لذتِ قرضِ حسن

یعنی قرآن کیا ہے؟ ظالم آقا کے لئے پیغامِ موت ہے۔ وہ بے ساز و سامان غلام کا دستگیر ہے ۔۔۔ سونا چاندی سمیٹنے والے شخص سے کسی بھلائی کی توقع نہ رکھو، اور تم وسعت و کشادِ پا ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ مال کو انسانیت کی بہبود کے لئے خرچ نہ کرو ۔۔۔ سود سے آخر پیدا کیا ہوتا ہے سوائے فتنے کے۔ اور کوئی شخص قرضِ حسنہ کی لذت سے آشنا ہی نہیں۔

قرآنِ کریم نے، زمین یعنی ذرائع پیداوار کے بارے میں کہیں اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ، کہیں سَوَاءً لِّلسَّآئِلِيْنَ اور کہیں مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ کہا ہے۔ اور اس طرح اُس نظام کی اصل و بنیاد پر ضربِ کاری لگائی ہے جس میں مزدور محنت کرتا ہے لیکن پورا معاوضہ حاصل نہیں کر سکتا، کسان غلّہ اُگاتا ہے لیکن خود بھوکے پیٹ سو جاتا ہے ۔۔۔ ایک انسان کد و کاوش کرتا ہے لیکن اس کا صلہ کوئی اور لے جاتا ہے ۔۔۔ اقبال نے اسی بات کو "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی کہلوایا ہے: ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
عہدِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بنا تا ہے امیں

اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

محنت کش طبقہ جو عرفِ عام میں مزدور کہلاتا ہے، اُس کے لئے سب سے زیادہ اثر انگیز اور متأثر کن چیز نظامِ معیشت ہی ہے جس سے اُس کی محنت کا معاوضہ طے پاتا ہے۔ اگر نظام ہی باطل ہو تو اس کی تمام تر محنت

انحطاط اور اس کی زندگی اجیرن۔ پس اسی بناء پر اقبال نے "لینن" سے "خدا کے حضور" میں کہلوایا تھا کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

نظامِ سرمایہ داری میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ ایک انسان دوسرے انسانوں کی محنتوں کا ثمرہ خود غصب کر جاتا ہے بلکہ وہ ایسے قوانین وضع کرتا ہے جس سے ایک طبقہ ذلت کی عمیق تہوں میں ڈوبتا ہے اور دوسری طرف چند نفوس عیش کوشیوں کی حدود کو پھلانگتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا کچھ کرنے کے لئے سرمایہ پرست ہر قسم کا حربہ استعمال کرتا ہے اور انتہائی انداز میں مذہب کو بھی استعمال کرتا رہتا ہے۔ وہ بندۂ مزدور کو انسان کے خود ساختہ مذہب کی توہم پرستیوں میں الجھا کر خود دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور یوں مزدور ہامان وقارون دونوں کا شکار ہو جاتا ہے ـــــ اسی لطیف نکتے کو اقبال نے "پیامِ مشرق" کی نظم "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

غوغائے کارخانۂ آہن گری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر دمی نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبا ازانِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد ازانِ من — صہبائے پاک آدم و حوّا ازانِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر ازانِ من — ظلِ ہما و شہپرِ عنقا ازانِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او ازانِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلےٰ ازانِ تو

نظام میں سرمایہ دار، مذہبی اصطلاحات کا سہارا لیتے ہوئے مزدور کو یوں مطمئن کرتا ہے کہ "کارخانۂ آہن سازی کا تمام شور و غوغا میرے لئے ہے اور کلیسا میں بجنے والے ساز کے حسین و دلپذیر نغمے تیرے لئے ـــــ وہ درخت جن پر بادشاہ نے ٹیکس لگا رکھے ہیں، بدقسمتی سے میرے حصے میں آئے اور تیرے حصے میں شجر سدرہ و طوبا اور باغِ بہشت جیسی نعمتیں ہیں ـــــ وہ کڑوا پانی (یعنی شراب) جو دردِ سر پیدا کرتا ہے میرے حصے میں آیا اور بہشت میں آدم و حوا کی پاک شراب تجھے مرحمت فرمائی گئی ـــــ مرغابی، چکور اور کبوتر جیسے سفلی پرندے مجھے کھانے کو ملے اور ہما و عنقا جیسے بلند و مبارک پرندوں کا سایہ تجھے نصیب ہوا ـــــ زمین کی یہ مٹی اور جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے سب مجھے سنبھالنا پڑا اور خاکِ زمین سے عرشِ معلےٰ تک سب کچھ تیری جاگیر۔

مفکرِ اسلام، شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی نمایاں خصوصیت ہی یہ ہے کہ انہوں نے بنی نوعِ انسان کے سب سے زیادہ برگزیدہ طبقے یعنی محنت کش عوام و مزدور کا رتبہ نہ صرف پہچانا بلکہ ایک دنیا کے گوش گذار کیا۔ وہ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" سے بھی عظیم تر "ادب برائے انقلاب" کے قائل تھے۔ اُن کے یہاں حالیؔ کے سوز و گداز کے ساتھ ایک انقلاب آفریں "صاحبِ ضربِ کلیم" کا ولولہ، جوش، یقینِ محکم اور عزمِ صمیم پایا جاتا ہے۔ بندۂ مزدور کے لئے ان کا یہ ولولہ انگیز پیغام منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو گا ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

لیکن اقبالؔ، اس انقلاب کو فساد کے ذریعے نہیں لانا چاہتا، بلکہ قلب و نگاہ کی قرآنی تبدیلی سے لانا چاہتا ہے اور یہی اُس کی مومنانہ فراست ہے۔

والسلام

بزمِ خواتین

پرویز صاحب کے درسِ قرآنِ کریم (لاہور) سے مستفید ہونے والی خواتین نے بزمِ طلوعِ اسلام قائم کی ہے اور محترمہ بہن، بیگم سکندر اسلام کو اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔

دُعا ہے اللہ تعالیٰ ہماری ان بہنوں اور بیٹیوں کی ہمت میں برکت اور ارادوں میں استحکام عطا فرمائے تاکہ وہ فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت میں بیش از بیش حصہ لے سکیں۔

امید ہے ان کا یہ مستحسن اقدام، دوسرے مقامات کی خواتین کے لئے قابلِ تقلید نمونہ کا کام دے گا۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور

خورشید عالم

استعمار کا عالمی کردار (۲)

فروری کے شمارے میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اقوامِ یورپ اپنے گھروں سے نکل کر دوسرے ملکوں پر ایسی مسلّط ہوئیں کہ آکاس بیل کی طرح ان کی نشو و نما کو روک دی۔ ان کی ضرورت دوہری تھی۔ ایک طرف انہیں ایسی منڈیوں کی ضرورت تھی جہاں ان کی روز افزوں مشینی مصنوعات کی مقابلے کے بغیر اور گراں قیمتوں پر کھپت ہو سکے اور دوسری طرف انہیں خام مال ارزاں اور وافر مل سکے۔ یہ کہنا بعید از قیاس نہیں کہ ایشیائی ممالک یوں یورپ کے قبضے میں نہ آجاتے تو وہ حرفت میں اس حد تک ترقی کر چکے تھے کہ انہیں اپنے ہاں صنعتی انقلاب برپا کرتے میں بہت زیادہ عرصہ نہ لگتا۔ اگر اتفاق سے ایشیا مشینی دور میں پہلے داخل ہو گیا ہوتا تو تاریخ استعمار یورپ کے قرونِ مظلمہ سے محفوظ رہتی اور عہدِ حاضر کے انسان کے لئے دنیا یوں جہنم نہ بن گئی ہوتی جیسے یورپی انسان نے بنا کے رکھ دی ہے۔ یہ اتفاق بعید از قیاس نہیں تھا۔ ایک مشرقی پاکستان کی مثال یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہاں پارچہ بافی اس اوجِ کمال تک پہنچ چکی تھی کہ یکایک روزگار ہنرمندوں کے بُنے ہوئے کپڑے دور دراز ملکوں میں اپنے لئے ایسی نمایاں جگہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ کوئی حریف ان کے مقابلے میں ٹھہرنا تو درکنار ان کے سامنے آنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ انگریز مشین کے زور پر دستی کھڈیوں کے بنائے ہوئے کپڑے کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تھے۔ اپنے ہاں انہوں نے اپنے بُنے ہوئے کپڑے کو حب وطن کے واسطے رائج کرنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ پاکستانی کپڑے کا استعمال پہلے گرجاؤں میں اور پھر عام طور پر ممنوع قرار دینے سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ بیرونی منڈیوں میں ایسی ساکھ اور دھاک بیٹھنے کا لامحالہ نتیجہ نکلتا کہ پارچہ باف ہاتھوں پر تکیہ کرنے کی بجائے مشینوں کا سہارا لیتے۔ وہ اڑنے کو تھے کہ گرفتارِ یورپ ہو گئے۔ یورپ نے ممالکِ محروسہ کی ترقی روک دی۔ اس نے یہ امکان بھی ختم کر دیا کہ صنعت کو کسی طور فروغ مل سکے۔ چنانچہ توجہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرف دی گئی تاکہ خام مال کی پیداوار میں ضرورت کے مطابق اضافہ ہو۔ قدرتی طور پر یہ طبقہ سامراجی قوت کی عنایات کا مستحق ٹھہرا۔ اور اپنے شاہوں کے دستِ کرم سے محروم ہو جانے کے

باوجود مراعات یافتہ رہا۔ اس کے ساتھ ایک اور مراعات یافتہ طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ طبقہ کاروباری تھا۔ اس کا کام خام مال کو برآمد کرنا اور غیر ملکی مصنوعات کو درآمد کرنا تھا۔ دونوں طبقے سامراجی حکمرانوں کے مرہونِ منت تھے لہٰذا ان کے ثناخواں بھی اور آلۂ کار بھی۔ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقات بربنائے مفادِ خویش جتنی آسانی سے سامراج کے کارندے بن جاتے ہیں اسی بے دریغی سے اپنے ہاں استحصال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گویا وہ سامراج کے ہاتھوں لٹتے ہیں اور ملک ان کے ہاتھوں لٹتا ہے۔ اس لوٹ کو وہ آزاد تجارت کا نام دیتے ہیں اور اس کے گن گاتے نہیں تھکتے۔

اقوامِ یورپ نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو نوازا تو معاشی استحصال اور معاشرتی استبداد کا سلسلہ اور دراز ہو گیا۔ اسے استحکام اور دوام بخشنے کے لیے ثقافتی محاذ کھولا گیا اور ممالک محروسہ کے تشخص کو تباہ کر کے ان پر یورپی ملمع چڑھایا جانے لگا۔ جاگیرداروں کا تسلط دیہات کی غالب اکثریت پر تھا اور سرمایہ داروں کا اثر شہروں پر۔ یہ دو گندے نالے ملکی کھیت کا حلیہ بگاڑنے کے لیے کم نہیں تھے۔ کہ ثقافتی بنیادیں کھوکھلی کی جانے لگیں۔ ممالک مقبوضہ میں یہ پروپیگنڈہ پوری ڈھٹائی سے کیا جانے لگا کہ اقوام ایشیا پسماندہ ہیں۔ وہ یورپ سے صدیوں پیچھے ہی نہیں اپنے مزاج اور اعمال کی بنا پر انہیں پیچھے ہی رہنا چاہیئے۔ یورپ کا ان پر احسان ہے کہ انہیں قرونِ مظلمہ سے نکالنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ایشیا نہ محنت کرتا ہے نہ کر سکتا ہے۔ یورپ محنتی بھی ہے اور ہنرمند بھی۔ اس کا کرم ہے کہ اپنی پیداوار اور محنت اور ہنر سے ایشیا کو بہرہ مند کر رہا ہے۔ گویا یورپ نے مغلوب اقوام کی ترقی کے راستے مسدود کر دیئے۔ اور انہیں خوب لوٹا لیکن باور انہیں یہ کرایا کہ ان میں ترقی کی نہ امنگ ہے نہ صلاحیت۔ لہٰذا انہیں اپنی قسمت پر شاکر رہ کر یورپ کا شکرگذار ہونا چاہیئے کہ وہ ان کی پسماندگی اور اپنی ترقی میں فاصلہ کم کئے جا رہا ہے۔ اپنے ممنونِ احسان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو مرعوب کرنے کے لئے سامراجیوں نے انہیں طرح طرح کے سبز باغ دکھلائے۔ ان کے بچوں کو بڑی فیاضی سے وظائف دیئے گئے اور ایک ایک کر کے اپنے ہاں سیر اور تعلیم کے لئے بلایا گیا۔ یوں لٹیروں نے لوٹ کے مال سے بھرے گھر ان کو دکھائے جن کے گھروں کو وہ لوٹ رہے تھے۔ اپنے ہاں بلانے سے پہلے انہیں پادریوں اور مشنری سکولوں کی حشیش پلائی جا چکی تھی۔ ان بچوں نے روئے زمین کی یورپی جنت دیکھی تو ان کی آنکھوں میں چکا چوند ہو گئی اور ان کے دل میں اپنی روایات و ثقافت کی کچھ آلائش رہ گئی تھی تو ساحرِ افرنگ نے اسے یوں دھو ڈالا۔ ان بچوں نے یورپ کو تہذیب و اقدار کا سرچشمہ پایا اور یورپ کی غلامی کی لعنت کو رحمت سمجھنے لگے۔ یوں حاکم اور محکوم اقوام کے مبنی بر استحصال تعلق کو تعاون کہا اور کہلوایا گیا۔ اس "تعاون" کو "دولتِ مشترکہ" کا نام دیا گیا تو تعاون کا سامراجی تصور ذہنوں میں ایسا چپک کے رہ گیا کہ آزادی کا طویل زمانہ بھی ذہنوں کو صاف نہیں کر سکا۔ دولتِ مشترکہ کو آج بھی یکساں طور

پر آزاد اور مساوی طور پر حصہ دار ممالک کا رضاکارانہ ادارہ سمجھا جاتا ہے اور ان کے تماشوں میں شرکت کے مذاق کو قومی شان کے شایان سمجھا جاتا ہے۔ ایک رشتۂ استحصال میں پروئے ہوئے "سامراجی بھائی" مرکزِ سامراج میں تو ایک گول میز کے اردگرد بزعمِ خود مساوی طور پر بیٹھ جاتے تھے لیکن ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت بھری جاتی رہی۔ باہم حریف ہونے کی بنا پر اقوامِ یورپ نے مقبوضہ ممالک میں یہ خوف ابھارا کہ انہیں ہمسایوں سے خطرہ ہے۔ مثلاً برصغیر میں انگریز پہنچ گئے تو انہوں نے سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح روس یہاں تک نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ روس کے خلاف بھی فضا پیدا کی گئی اور روس جس افغانستان کے راستے آسکتا تھا اس افغانستان کے خلاف بھی فضا پیدا کی گئی۔ یوں دو ہمسایوں میں ایک دوسرے کے متعلق شکوک پیدا اور راسخ کئے گئے اور اپنے متعلق یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ برطانیہ برصغیر میں موجود نہ ہو تو روس اس پر قابض ہو جائے۔ اور بالفرض روس نہ آئے تو افغانستان تو ضرور پہنچ جائے۔ یوں برصغیر میں برطانیہ نے یہ احساس بھی ابھارا کہ وہ اس قدر کمزور ہے کہ اپنا تحفظ بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس ممنونیت کو بھی جنم دیا کہ انگریز جیسی طاقت ان کی حفاظت کے لئے موجود ہے۔ گویا ایک لٹیرا یہ کہہ کہہ کے احسان جتاتا رہا کہ وہ لوٹنے نہ پہنچ جاتا تو اس گھر کو دوسرا لٹیرا لوٹ جاتا، اور اب جب وہ اس مکان کو خود لوٹ رہا ہے وہ کسی اور لٹیرے کو لوٹنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اس نے یہ بھی انتظام کر رکھا تھا کہ لوٹتے لوٹتے وہ آنکھ اٹھا کے پوچھے کہ کیا میں تمہارا محافظ نہیں ہوں؟ تو "بلی" کہنے والوں کا شور مچ جائے۔

یورپ نے یہ کہا اور کہلوایا کہ اس نے غیر یورپی دنیا میں آزادروی، رواداری اور ترقی پسندی کی طرح ڈالی۔ ورنہ اس کے علاوہ دوسری قومیں اپنے ناقابلِ رشک ماضی میں الجھ کر پیچھے دیکھنے کی ایسی عادی ہو گئی تھیں کہ ان کا آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے اقوامِ عالم کی سوچ کا محور یورپ کو بنا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، اور یورپ کی عظمت اور اس کا رعب چار دانگِ عالم میں خوب خوب بٹھایا۔ اس نے آزادی کے گیت بھی گائے، اور خوب گائے، اور مغلوب اقوام میں اپنے دم ساز پیدا کئے اور شاباش لی کہ وہ انہیں اپنے خلاف بڑی جرأت سے تیار کر رہا ہے۔ یورپ نے یہ شاباش بھی لی اور اس کے ساتھ ہی سامراج کی شکار اقوام کو یہ احساس بھی دلایا کہ وہ آزادی کے قابل نہیں اور انہیں بڑی دریا دلی اور چابک دستی سے آزادی کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل بنایا جا رہا ہے۔ کہیں خودسری اور بے صبری کا مظاہرہ کیا گیا تو اسے پوری قوت سے کچلا گیا اور پدرانہ شفقت کی سفیدی زندانِ استعمار پر دیدہ دلیرانہ پھیر کر قائل کر دیا گیا کہ اہلیت پیدا ہوتے ہی آزادی کا بے در و دیوار گھر بنا دیا جائے گا۔ آزادی کا جو تصور رائج کر کے روبہ عمل لایا گیا وہ یورپ سے گلو خلاصی کا نہیں، بانداز دگر رضاکارانہ طور پر یورپ کے تابع فرمان ہونے کا تھا۔ جیسا کہ پچھلے شمارے میں بتایا جا چکا ہے، یورپ نے ایسے مسائل پیدا کئے اور فتنے کھڑے کئے کہ جن سے متعلقہ قوم آزاد ہونے کے بعد ہدایت و رہنمائی کے لئے سابق حکمران قوم ہی کو واحد قابلِ عمل

نمونہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوا اور آزادی کو قومی تقاضوں کے مطابق نظام کی تشکیل نو نہ سمجھے بلکہ ہیئتِ حاکم کو بدل کے خوش ہو جائے کہ قومی تقدیر کے مرتب ہونے کے سامان پیدا کر لئے گئے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے مغلوب اقوام بالعموم سمجھنے سے قاصر رہ گئیں۔ انہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے چلے جانے اور ان کی جگہ اپنوں کے آجانے کو آزادی کا مغز سمجھ لیا۔ یورپ نے آزادی کا تصور بھی یہی دیا اور اس سے مختلف آزادی عطا بھی نہیں کی چنانچہ آج وہ برسوں کے دورِ آزادی کے بعد حیران ہیں کہ اپنوں سے اس قدر یا اس سے زیادہ عاجز اور نالاں کیوں ہیں جتنی وہ سامراجی حکمرانوں سے ہوا کرتی تھیں۔ اس سے نو آزاد ممالک میں عمومی ہیجان و خلفشار پیدا ہو گیا ہے۔ یہ گرہ کھلنے تو لگی ہے لیکن یورپ اس سے بھی یہ نتیجہ نکالے دے رہا ہے کہ ہم نہ کہتے تھے کہ آپ آزادی کے اہل نہ تھے۔ یہ کہہ کے اپنے سامراجی کردار کی پردہ پوشی کی جا رہی ہے۔ اپنے کردار سے مزید توجہ ہٹانے کے لئے ملکی حکمرانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ اندرونِ ملک شر پسند عناصر فتنہ و فساد پیدا کر رہے ہیں اور وہ ان عناصر کی شہ پر ایسا کر رہے ہیں جنہیں یورپ اپنے طور پر بین الاقوامی شر پسند کہتا ہے۔

اپنے نظمِ سیاسی کو یورپ نے انسانی علم اور تجربے کا نچوڑ قرار دیا۔ اس نے کہنے کو وقتاً فوقتاً یہ ضرور کہا کہ یہ نظم انسانوں کا بنایا ہوا ہے لہٰذا مکمل اور ناقابلِ ترمیم نہیں لیکن معناً اسے اس نے حرفِ آخر ہی سمجھا۔ اور کسی اور نظمِ سیاسی کے اس کے مقابلے میں آنے کا روادار نہیں ہوا۔ اس نظام کے خلاف بڑی پُرجوش اور سنجیدہ غور کے قابل آواز مارکس نے اٹھائی۔ یورپی ہونے کی بنا پر مارکس کی جرح و تنقید کو چنداں قابلِ اعتراض نہ سمجھا گیا۔ لیکن مارکسیت روس میں نافذ ہوتی دکھائی دی تو یورپ کو فکر دامنگیر ہو گئی۔ اس پر بات ظاہری رواداری کی نہیں رہی تھی، بلکہ مغربی نظام کی عملی نفی تک پہنچتی دکھائی دینے لگی تھی۔ یورپ آپے سے باہر ہو گیا اور روس ایک اچھوت بن گیا جو یورپ کی مہذب محفل میں بار پانے کے قابل نہ رہا۔ اتفاق کی بات کہ اقوامِ یورپ کے خلاف برسرِ پیکار ہو کر جرمنی نے روس پر حملہ کر کے اشتراکی اچھوت کو یورپ کا حلیف بنا دیا۔ یوں برہمن اور اچھوت ایک گھاٹ پر اکٹھے ہو گئے۔ لیکن یورپ کے برہمن کو ایک اور اچھوت تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ مارکس اور لینن کے دریافت کردہ اصول معاشرت چین میں بھی پہنچکر برگ و بار لانے لگے۔ جو انقلاب چین میں پرورش پا رہا تھا اس کی داغ بیل ۱۹۲۱ء میں ڈال دی گئی تھی جب کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس انقلاب نے ماؤزے تنگ کی شخصیت کو ابھارا، اور اسے نہ صرف انقلابِ چین کا قائد بنا دیا بلکہ چین میں کامیابی کے بعد عالمی اشتراکی انقلاب کے رہنما کا درجہ دیدیا۔ یہی 'چی' وہ فکر و عمل کے لحاظ سے مارکس، لینن اور سٹالین کے ہمدوش ہو گیا۔ ایسے قائد کے لئے یورپ کسی قسم کی رواداری دکھانے کے لئے تیار نہیں۔ جیسے کبھی روس کو اچھوت سمجھا گیا تھا، اسی طرح یا اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ چین اور اس کے عظیم رہنما کو اچھوت سمجھ لیا گیا ہے۔

چین کا انقلاب اور ماؤ کے افکار دوسرے ممالک کے لئے قابلِ تقلید ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ ہر ملک ان کا مشاہدہ و مطالعہ کرکے کر سکتا ہے۔ لیکن استعمار نے ایسی فضا پیدا کر رکھی ہے کہ کئی ممالک میں یہ مطالبہ اندھا دھند کیا جانے لگا ہے کہ چین اور ماؤ کا ادب ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ ان ممالک میں ابھر رہا ہے جو استعمار کے تسلّط میں رہ چکے ہیں اور اب اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ ان کا سارا رونا یہی رہا ہے کہ یورپ نے جو مثال قائم کی اور علم اور تعلیم کے نام پر جو ادب پہنچایا اور پھیلایا اس نے ان کے لئے گوناگوں مفاسد پیدا کئے اور ان کی قومی اور معاشرتی بنیادیں متزلزل کیں۔ عام طور پر ان کا مطالبہ یہی رہا ہے کہ یورپ کی تقلید سے دست کش ہو کر اپنے آپ میں آنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اتنا کچھ ماننے اور اعلانیہ کہنے کے باوجود کسی نے اب تک یہ مطالبہ نہیں کیا کہ یورپ سے روابط ختم کر دیئے جائیں اور اس کا ادب ممنوع قرار دے دیا جائے تاکہ جو مفاسد گھر کر چکے ہیں، ان کا خاتمہ ہو سکے۔ اس کے برعکس، وہ کاروبار، علاج معالجے اور آرام تک کے لئے یورپ ہی کے کسی ملک کا انتخاب کرتے ہیں اور اس میں نہ کوئی عار محسوس کرتے ہیں نہ اپنے قول و فعل میں کسی قسم کا تضاد دیکھتے ہیں۔ مطالبہ ان کا ہے تو یہ کہ چین سے سروکار یا تو رکھا نہ جائے اور رکھنا ہی پڑے تو صرف اس قدر جس سے مضرت نہ ہو۔ یہ غیر روادارانہ روش عام کر کے یورپ بڑی سادگی مگر عیاری سے لینن کو ابھارنے لگا ہے۔ اس لئے نہیں کہ لینن کی اشتراکیت پر اسے اعتراض نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ لینن یورپی ہے۔ استعمار لینن کے سر پر سہرا باندھنا تو کیا چاہتا ہے، وہ ماؤ کے چہرے کو نوچنے کے درپے ہے۔ یہ استعمار کی ہی کرشمہ سازی ہے کہ مسلمانانِ برصغیر کی سیاست کا نقطۂ ماسکہ ایک عرصہ ترکی، فلسطین، الجزائر اور طرابلس رہے ہیں۔ ان ممالک کے جہادِ حریت میں وہ اپنے آپ کو ذہنی اور روحانی طور پر شریک سمجھتے رہے ہیں۔ انہوں نے دامے درمے اس جہاد میں ہاتھ بھی بٹایا ہے۔ لیکن ہمسایہ ممالک اسلامیہ سے متعلق ان کا ذریعہ معلومات یورپ رہا، اور اب تک ہے۔ مسلمانوں نے عربی پڑھی بھی اور پڑھتے بھی چلے آ رہے ہیں۔ لیکن عربوں کے متعلق خبر براستہ یورپ اور بالعموم بزبانِ انگریزی حاصل کرنے کا شغل اب تک جاری ہے۔ ابھی تک غیر شعوری طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گھر کے خط میں چہلم ہی کا ذکر کیوں نہ ہو "پائنیر" کہے کہ اس کا حال اچھا ہے تو بیمار کو زندہ تصور کرنا چاہیئے۔

۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء اور ۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء کی جن مہیب جنگوں کو عالمی یا عظیم جنگیں کہا جاتا ہے وہ علم بردارانِ سامراج کا باہمی اور ناگزیر تصادم تھیں۔ جب تک سامراجی اقوام نوآبادیات کی تلاش اور ان کی تقسیم میں لگی رہیں، ان کی مثال ایک ہی شاہراہ پر اپنی اپنی راہ چلنے والی گاڑیوں کی سی رہی۔ وہ ایک دوسرے کے راستے میں آکر باہم ٹکرا بھی جاتی تھیں لیکن پھر اپنی اپنی راہ لگ جاتی تھیں۔ کیونکہ دنیا وسیع تھی اور نوآبادیات کی کمی نہیں تھی۔ جب زمین بٹ چکی اور نوآبادیاں لٹتے لٹتے ایک زمانہ گذر گیا تو استعمار، سعدی کے الفاظ میں "روز نایافتن" کی مصیبت

سے دوچار ہوا۔ اب تنورِ شکم بھرنے کے لئے یہی ہو سکتا تھا کہ سامراجی قوتیں ایک دوسرے سے نوآبادیات چھینیں۔ دونوں جنگیں اسی چھینا جھپٹی کی مظہر تھیں۔ سامراج نے یوں اقوام غالب کا لہو گرمایا تو شرق و غرب نے طرفہ تماشہ دیکھا کہ نوآبادیات اپنی ملکیت بدلنے کی بجائے آزادی سے ہمکنار ہونے لگیں۔ نوآبادیات کے اندر شدید قسم کی تحریکیں زور پکڑ گئیں تھیں اور استعماری اقوام آپس میں لڑ لڑ کے اس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ سیاسی تسلط برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ وہ جس انداز سے آزادی کے وعدے کرتی چلی آئی تھیں اس کے پیش نظر ان کے لئے آزادی کو متاخر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ نوآبادیات آزاد ہونا شروع ہو گئیں اور استعمار نے حربے بدلنے شروع کر دیئے۔ نیا حربہ چین میں آزمایا گیا۔ وہاں روس کی دیکھا دیکھی اشتراکی رَو بیدار ہوئی۔ چین کے دریا سے اٹھی ہوئی موج چین ہی کے ساحل سے ٹکرانی چاہیئے تھی لیکن اس اٹھتی موج نے بھنور امریکہ میں جا پیدا کیا اور یہ ہر لحاظ سے بے تعلق ملک چین کی برسر اقتدار جماعت کا پشت پناہ گیا۔ چونکہ اشتراکی تحریک استعمار اور استعمار کے ملکی کارندوں کے خلاف تھی اور اس سے بالشویک روس کو فائدہ پہنچ سکتا تھا اس لئے امریکہ نے، کہ دوسری جنگ کے بعد وہ عالمی سطح پر استعمار کا علمبردار بن گیا تھا، اپنا یہ ذمہ سمجھا کہ چینی حکومت کو سہارا دے اور دیئے رکھے۔ امریکہ نے چین میں بے دریغ دولت لٹائی، اور سازوسامانِ جنگ جھونکا۔ یہ سب کچھ اس کے کام نہ آیا، اس لئے بھی کہ اس کے پٹھوؤں کو چین سے بالآخر بے دخل ہونا پڑا، اور اس لئے بھی کہ اس شکست سے وہ کوئی حقیقت پسندانہ سبق نہ سیکھ سکا۔ اس نے الٹا سبق سیکھا۔ اور چین سے پسپا ہونے کے بعد، کچھ ہی دیر کے بعد کوریا میں آزمایا۔ وہاں بھی اشتراکیت کی درانتی فصلِ استعمار کاٹنے کے لئے بے دریغ چلنے پر آ گئی۔ بزعم خود چین کی مثال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ نے کوریا کے جنوبی حصے میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اس کا خیال تھا کہ چیانگ کائی شک کی جیبیں بھرنے اور اس کی افواج کو اسلحہ سے لاد دینے سے جو نتیجہ پیدا نہیں ہو سکا تھا وہ امریکی فوجیں اپنے طور پر کوریا میں کر دکھائیں گی۔ امریکہ نے بڑے جتن کئے۔ اقوامِ متحدہ تک کو وہ گھسیٹ لایا اور اس بہانے بعض ملکوں سے فوجی اور بعض سے اخلاقی مدد لینے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ لیکن امریکہ کو کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کوریا کے تجربے کی خامیاں اس نے ویت نام میں دور کرنے کی کوشش کی۔ اس حساب کے مطابق ویت نام زیادہ دیر اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکنا چاہیئے تھا۔ گوریلے کوئی ایسی منظم فوج نہیں تھے۔ ان کے پاس نہ سرمایہ تھا نہ اسلحہ۔ وہ امریکہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے جس کے پاس نہ سپاہ کی کمی تھی نہ اسلحہ کی۔ پھر سپاہ بھی جدید تربیت یافتہ اور اسلحہ بھی جدید ترین! اس امریکہ کے لئے ایک ویت نام فتح کرنا بالکل ناکافی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ شمالی کوریا آزاد ہے اور جنوبی کوریا کا اسّی فیصد علاقہ حریت پسندوں کے قبضے میں ہے۔ امریکہ متعدد عالمی مراکز حکومت کی خاک چھان چھان کر اس میں کامیاب ہوا ہے کہ شمالی کوریا اس سے گفتگو سے امن کے لئے رضامند ہو جائے۔

ویت نام کے بعد استعمار کی نظریں بھارت پر ہیں۔ ویت نام کا سایہ کئی سالوں سے بھارت پر پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ اس سائے سے امریکہ اور بھارت دونوں اپنا اپنا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ امریکہ کو بھارت کا وسیع دفاعی محاذ مل جائے گا اور بھارت کو امریکہ کے بے پناہ وسائل میسر آجائیں گے۔ امریکہ اشتراکیت سے عہدہ برآ ہو لے گا اور بھارت پاکستان سے۔ یہ ملی بھگت کب کی ہو چکی ہے اور اس کے نتائج بھی سامنے آتے چلے جا رہے ہیں لیکن امریکہ کا تجربہ بڑا تلخ ہے۔ چین، کوریا اور ویت نام میں اس کی تمام تدبیریں الٹی ہو چکی ہیں۔ مزاجِ روزگار اس سرعت سے بدل رہا ہے کہ امریکہ متوحش ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؛ شکست وہ بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتا وہ بھارت کی بساط پر اپنا کھیل تو کھیلے چلا جا رہا ہے۔ لیکن اس امکان کے پیشِ نظر کہ کل بھارت کا نقشہ ایسے بدل سکتا ہے کہ یا تو وہ بالکل پیش قدمی ہی نہ کر سکے یا تھوڑی بہت پیش قدمی کرے تو ایسی پسپائی نصیب ہو کہ ایشیا میں کہیں اس کے پاؤں نہ جم سکیں۔ وہ ایک طرف سمندروں پر متمکن ہوتا جا رہا ہے اور دوسری طرف خلاء میں دخیل ہوتا جا رہا ہے۔ سمندر میں وہ کھلے بندوں پھر سکتا ہے اور کسی مقامی آبادی کا اسے منت کش نہیں ہونا پڑیگا۔ جہاں تک خلاء کا تعلق ہے وہاں قدم جما کے وہ زمین کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ چنانچہ جو کام ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء کے ان سالوں میں نہیں ہو سکا تھا جب امریکہ ایٹم بم کا تنہا مالک تھا وہ فضا میں پہنچکر زیادہ وثوق سے ہو سکے گا۔ خلاء میں اسے خدشہ زیادہ سے زیادہ روس کا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ آج اس کا خلائی حریف ہے تو کل رفیقِ استعمار بھی ہو سکتا ہے۔ امریکہ کے پاس یہ سوچنے اور باور کرنے کی گنجائش موجود ہے کہ روس اس کا شریکِ استعمار اور شریکِ کار ثابت ہو سکے گا۔ دوسری جنگ میں جرمن دشمنی نے دونوں کو حلیف بنا دیا تھا۔ اب جرمنی کی جگہ چین نے لے لی ہے۔ اس مشترک دشمن کے خلاف امریکہ اور روس آج حد تک متحد ہیں اس کا مظاہرہ بھارت میں ہو رہا ہے۔ دونوں اپنے اپنے طور پر بھارت کو چین کے خلاف مسلح کر رہے ہیں۔ یہ اشتراک و تعاون خلاء تک بھی پہنچایا جا سکتا ہے' اور پہنچ گیا تو امریکہ اور روس عالمِ بالا میں زمین کی قسمت کا فیصلہ کر سکیں گے۔ امریکہ کو اس کا اسقدر یقین ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی جارحیت کے بعد کوسیگن اور جانسن میں ملاقات ہوئی تھی تو جانسن نے ایک برطانوی اخبار کی اطلاع کے مطابق، کوسیگن کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ دونوں مل کے کرۂ ارض کو تقسیم کر لیں۔ زمین کا یہ قصہ زمین ہی پر طے نہ ہو سکا تو چاند پر بیٹھ کر کر لیا جائے گا۔ یہ ہو گا یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن استعمار کی سوچ ایسی ہی نظر آتی ہے۔

سمندر اور خلاء کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوتے چلے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ استعمار زمین کے ہنگاموں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ دور ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ ساری کارستانی کارِ زمین ہی کو نپٹانے کے لئے ہے۔ خشکی پر کوریا ہے، ویت نام ہے، بھارت ہے، اسرائیل ہے۔ کوریا میں امریکہ خود لڑا اور ویت نام

میں لڑ رہا ہے۔ بھارت میں شاید اسے ایسا ہی کرنا پڑے۔ کیونکہ ایک وقت کے بعد امریکہ تماشائی نہیں رہ سکیگا۔ اسرائیل البتہ ایسا مقامِ استعمار ہے جہاں وہ نہ براہ راست لڑ رہا ہے اور نہ شاید اسے لڑنے کی ضرورت محسوس ہو۔ اسرائیل کے لئے بحیرہ روم میں امریکی بیڑے کی موجودگی کافی ہے۔ جہاں تک اس کے حق میں لڑائی کا تعلق ہے وہ اقوامِ متحدہ کے محاذ پر پوری عیاری اور کامیابی سے لڑی جا رہی ہے اور لڑی جاتی رہے گی۔ ان مقاماتِ استعمار پر امریکہ کا تجربہ ایسا ہے جس سے وہ خود فریبی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اسے بھارت سے بہت سی امیدیں ہیں۔ اسرائیل نے تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ امریکہ اس ضمن میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کر رہا ہے جو بالآخر فیصلہ کن ثابت ہوگا اور استعمار پر کاری ضرب لگائے گا۔ یہ عنصر ہے عوام کی بیداری اور تنظیم۔ بیدار اور منظم عوام کا مقابلہ کوئی ملکی یا غیر ملکی طاقت نہیں کر سکتی۔ چین کی حالیہ تاریخ اس پر شاہد ہے۔ عوامی جنگ کی بے پناہی مشکوک ہوتی تو امریکہ چین سے اپنا سا منہ لے کے نکل آنے پر مجبور نہ ہوتا۔ یہی کچھ ویت نام میں ہو رہا ہے۔ حریت پسندانِ ویت نام نے اپنے خون سے یہ اصول لوحِ تاریخ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا ہے کہ اصل طاقت عوام ہیں، نہ استعمار، نہ استعمار کے آلۂ کار۔ بھارت میں عوامی سطح پر بیداری ابھی عام تو نہیں ہوئی لیکن اس کی طرح پڑ چکی ہے۔ اور جس طرح بھارت آئے دن یہ واویلا کرتا رہتا ہے کہ بعض صوبوں میں کسانوں کو چین کی طرف سے اسلحہ مہیا کیا جا رہا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اسلحہ چین کی طرف سے آ رہا ہے یا کسی اور ملکی یا غیر ملکی ذریعے سے، بھارت میں مسلح جنگ کی طرح ضرور پڑ چکی ہے۔ یہ جنگ ایک حد تک شدت اختیار کرنے کے بعد بھارت کو اس موڑ پر لے آئے گی جہاں استعمار کے سارے حربے بیدار اور منظم عوام کے سامنے بیکار ہو جاتے ہیں۔ امریکہ بزعمِ خویش یہ سمجھ سکتا ہے کہ بھارت میں یہ موڑ آیا بھی تو بہت دیر کے بعد آئے گا۔ لیکن جو بیج بو یا جا چکا ہے، وہ بار آور ہو کے رہے گا۔

عوامی جنگ کی طرح بھارت ہی میں نہیں پڑ چکی اسرائیل کے بطن سے بھی ابھر آئی ہے۔ عالم عرب میں شکست عربوں کی نہیں ہوئی ان کے سربراہوں کی ہوئی ہے اور ان نظاموں کی ہوئی جس کے وہ پشتیبان چلے آ رہے تھے۔ یہ سربراہ شکست کھا کے بھی اپنے آپ میں نہیں آئے، اور نہ آنے کا کچھ ایسا ولولہ ہی رکھتے ہیں۔ وہ پہلے بھی آپس میں لڑ رہے تھے، اب بھی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ وہ پہلے بھی اپنے عوام سے علیحدہ تھے اور اب بھی علیحدہ ہیں۔ ان کا تکیہ نہ اپنے آپ پر تھا نہ اپنے عوام پر۔ وہ سمجھتے تھے اور سمجھ رہے ہیں کہ اپنے ملک کے عوام نہیں بیرونی ممالک کے حکمران ان کے پشت پناہ ہیں۔ فلسطین ان کے مابین متفقہ مسئلہ نہیں استخوانِ نزاع ہے۔ خود حل کرنے سے قاصر رہ کر یہ سربراہانِ حکومت سمجھتے ہیں کہ اس کا حل یا روس کے پاس ہے یا اقوامِ متحدہ کے پاس۔ اپنے آپ میں اعتماد کی افسوسناک کمی کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ـــ تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں ـــ

چنانچہ طواف وہ جنیوا اور لندن ہی کے کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ فلسطین کا حل یہ ہے کہ سلامتی کونسل کی فلاں قرار داد پر طرفین سے عمل کرایا جائے۔ یہ طرز عمل قومی سطح پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی جس سوچ کا پیدا کردہ ہے وہ سوچ استعمار ہی کی ابھاری ہوئی ہے۔ اس نے "آزاد" قوموں کے کانوں میں یہ افسون پھونک رکھا ہے کہ استعمار وہ سہارا اور وہ پناہ ہے جس کے بغیر غیر ترقی یافتہ ممالک نہ سنبھل کے بیٹھ سکتے ہیں نہ سنبھل کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ استعمار کے بغیر وہ بیٹھے بھی گئے تو، اور کھڑے بھی ہوئے تو، وہ نہ بیٹھے رہ سکیں گے نہ کھڑے رہ سکیں گے۔ استعمار کی اس سوچ اور "آزاد" ممالک کی اس قبولیت کا نتیجہ ہے کہ فلسطین کے فیصلے کے لئے نظریں اقوام متحدہ پر جمنے لگی ہیں۔ یہ فیصلہ کرے گا کون! چار بڑی طاقتیں ـــ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس۔ یہ طاقتیں آپس میں مذاکرات کریں گی اور ایک دوسرے کو سمجھائیں گی کہ ہر ایک کا فلسطین میں استعماری مفاد کیا ہے اور وہ اپنی اپنی میزان میں دوسروں کے استعماری مفاد کو کتنا وزن دینے کے لئے تیار ہوں گی۔ یوں سودا ہوگا اور یہ گرگ برۂ معصوم کا گوشت تقسیم کرینگے۔ وہ کہہ رہے ہیں اور عرب اس کہنے میں آ رہے ہیں کہ یہی ممالک اپنی قوت اور عالمی حیثیت کی بنا پر اس کے اہل اور حقدار ہیں کہ اسرائیل اور عربوں میں مفاہمت کرائیں۔ عرب سربراہ مچل رہے ہیں اور مچلتے دکھائی دیتے ہیں تو اس بات پر کہ وہ گوشت کم نہیں لیں گے۔ یا ران لیں گے تو پوری کی پوری لیں گے۔ ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ برۂ معصوم میرا ہے یا میں خود ہوں، اور اس گوشت پر کسی اور کا حق نہیں۔ استعمار گوشت کی تقسیم میں اس لئے بھاگ دوڑ کرنے لگا ہے کہ اس کی سوچ کا توڑ محشرستانِ فلسطین میں پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اہل فلسطین جو لاکھوں کی تعداد میں ۱۹۴۸ء میں گھروں سے نکلے، اور اب تک بے گھر ہیں، اور جن کی دوسری نسل مہاجر کیمپوں میں پیدا ہو کر، پل کر جوان ہو چکی ہے، وہ اس فکر کو بھی پیدا اور جوان کر چکے ہیں کہ غلامی سے امتوں کی نجات ـــ خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے۔ ان بے گھر اور بے یار مہاجرین میں ۱۹۵۶ء میں اور اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں ایک اور سیلاب آیا لیکن یہ سیلاب استعماری فکر و عمل کے خس و خاشاک بھی بہا کر لے گیا اور ـــ زقید و صید ننگاں حکایتے آور ـــ کا نعرہ فلسطین کے گوشے گوشے سے اٹھنے لگا۔ یہ مجاہدین آزادی فلسطین کے اندر لڑ رہے ہیں۔ ان میں نوجوان ہیں، بچے ہیں، لڑکے ہیں، لڑکیاں ہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑا ہتھیار یہ ایمان ہے کہ اپنا فیصلہ وہ خود کریں گے۔ اور کر کے رہیں گے۔ ان مجاہدین کا نہ جنازہ اٹھتا ہے نہ کہیں مزار بنتا ہے۔ ان کا جنازہ تاریخ اپنے کندھوں پر اٹھائے گی اور تاریخ ہی ان کا "مزار" بنے گی۔ مزار جو زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہوگا۔ جو سیلاب کبھی بے چارگی سے فلسطین سے بہہ کے نکل آیا تھا، اب تند و تیز سیلاب بلا بن کر فلسطین کو واپس جانے لگا ہے۔ اس میں اسرائیل کا گھر بھی بہے گا، استعمار کا بھی، استعمار کے ذہن کا بھی، یہ گھر بنتے بنتے بہے گا لیکن بہہ کے رہے گا۔ اب تک البتہ استعمار کے اثر کا یہ عالم ہے کہ فلسطین پر دنیائے اسلام میں آنسو بہائے جاتے ہیں اور عربوں کے ماتم میں شرکت کا

یقین دلایا جاتا ہے۔ لیکن یہ اظہارِ شاہاں بہ شاہاں دہند شے آگے نہیں بڑھتا۔ کوئی مجاہدینِ آزادی کو نہیں پوچھتا انہیں چھوٹے اسلحہ کی ضرورت ہے، انہیں سرمائے کی ضرورت ہے، انہیں کپڑے کی ضرورت ہے، انہیں دوائیوں کی ضرورت ہے، انہیں ایسے رضاکاروں کی ضرورت ہے جو ان کے مراکز میں ان کی کچھ خدمت کر سکیں اور انہیں جہادِ حریت کے لئے فارغ کر سکیں۔ مسلمانوں کی کوئی حکومت، مسلمانوں کی کوئی جماعت، ان کے لئے پریشان نہیں ہوتی حالانکہ حکومتیں ان مجاہدین کی مدد کر سکتی ہیں، نجی ادارے حتیٰ کہ عام افراد ان مجاہدین کی مدد کر سکتے ہیں۔ یہ بھی استعماری سوچ ہی کا شاخسانہ ہے کہ مدد زبانی جمع خرچ تک محدود رہے اور زبانی جمع خرچ سربراہانِ حکومت سے ہونا چاہیئے۔

کوریا، ویت نام، بھارت اور اسرائیل ایسے مراکزِ استعمار ہیں جہاں استعمار لڑ رہا ہے یا اپنی پتلیوں کو لڑا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مراکز بھی ہیں جہاں رنگ و نسب کا تخمِ خبیث اس نے بویا اور اب اس کی فصل تیار ہو چکی ہے۔ استعمار نے جہاں بعض ملکوں پر ایسا قبضہ کیا جس سے بعد میں دستکش ہونا پڑا یعنی انہیں آزاد کرنا پڑا وہاں ایسے ممالک بھی ہیں جن پر قبضہ اس انداز سے کیا گیا کہ دوامی پٹہ اس کے نام کا ہی ہو جائے۔ فرانس نے الجزائر میں اسی طرح کا قبضہ کیا اور اسے مقبوضہ علاقہ نہ کہا بلکہ فرانس کا ایک صوبہ قرار دیا۔ یہ آہنی طلسم بالآخر ٹوٹا اور الجزائر آزاد ہو گیا۔ یہ طلسم جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ جیسے علاقوں میں ابھی تک قائم ہے اور استعمار اسے تقدیر کا نوشتہ سمجھ کے بیٹھ گیا ہے۔ نہیں، وہ بیٹھ نہیں گیا۔ اس نوشتے میں اضافہ بھی کرنے لگا ہے۔ رہوڈیشیا ایسا ہی علاقہ اور اضافہ ہے۔ برطانیہ نے جیسے فلسطین میں "اسرائیل" قائم کر دیا اسی طرح اس نے رہوڈیشیا میں بھی "باغی" حکومت قائم ہو جانے دی۔ اسرائیل کی طرح رہوڈیشیا میں بھی وہ ساری استعماری منطق کا زور اس پر صرف کر رہا ہے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتا اور یہ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہوا ہے لیکن مقبوضہ ممالک میں پوری قوت سے بغاوت کچلنے والا برطانیہ اپنی ناپسند کا اظہار کر کے بس کر دیتا ہے اور اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے نہ خود کچھ کرتا ہے نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ دوسرے بھی بزعمِ خود یہ سمجھتے ہیں کہ برطانیہ واقعی مجبور ہے اور اس کی مجبوری کا ضرورت سے زیادہ امتحان لیا گیا تو دولتِ مشترکہ کا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور سب دانے بکھر جائینگے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ دانے نہ ایک تسبیح کے تھے نہ انہیں استعمار کے رشتے میں منسلک ہونا یا رہنا چاہیئے تھا۔ دولتِ مشترکہ تسبیح کا رشتہ نہیں غلامی کی زنجیر ہے۔ اس پر آزادی اور مساوات کا ملمع ہے ورنہ دولتِ مشترکہ نہ آزاد ممالک کا ادارہ ہے نہ اس کے ارکان آپس میں مساوی ہیں۔ یہ استعماری حربہ ہے اور اس کے ذریعے استعمار کی سرکار سے جو فیصلہ ہوتا ہے اس پر ان سے صاد کرایا جاتا ہے جو اپنے آپ کو استعمار سے آزاد سمجھتے ہیں۔ اس کے آزاد، پا بہ گل، پا بہ زنجیر، پا بہ استعمار ہیں۔ استعمار کے فریب کا پردہ اب چاک ہونا چاہیئے اور آزاد ممالک کو آزادی

سے سوچنا چاہیئے کہ غلامی کی زنجیروں کے حلقے خوشنما کر دیئے جائیں تو وہ غلامی کی شدت اور ذلت کو کم نہیں کر سکتے۔ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ برطانیہ اسلام بھی قبول کر لے تو بے چارہ مسلمان غلام ہی رہے گا۔ ضرورت استعمار کی فصل کاٹنے ہی کی نہیں اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہے یہ امر حیران کن نہیں کہ زمانے کا ہاتھ اس جڑ تک پہنچنے لگا ہے۔ آج استعمار کے خوشے جل رہے ہیں تو کل اس کی جڑیں اکھڑی ہوں گی۔ کالے، نہتے، صدیوں کے مظلوم، تڑپتے، بلکتے بلال اٹھ رہے ہیں۔ ان کے پنجے استعمار کی شہ رگ کی تلاش میں ہیں۔ وہ استعمار کے آسان شکار نہیں رہے، انسان کے شکاریوں کے شکار کے سامان کرنے لگے ہیں۔ امریکہ، جنوبی افریقہ، رہوڈیشیا ان کے پاک اور گرم خون سے زندگی کی نئی تڑپ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس زندگی کے دھاروں میں استعمار بہہ جائے گا، بہ جائے گا لیکن یہ دھارے خون کے ہوں گے۔ ایشیا اور افریقہ میں خون کی ندیاں بہیں گی، بہتی رہیں گی۔ پھر کہیں استعمار کی وہ کدورت دھلے گی جو دل و دماغ کی گہرائیوں میں رچ بس گئی ہیں۔ رچا بسا دی گئی ہیں۔ یہ خون ملکوں ملکوں میں بہنے لگا ہے ۔۔۔ اور استعمار کی داستان ابھی جاری ہے ا (باقی آئندہ شمارے میں)

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار کی صبح - ۹ بجے
۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

کراچی میں
ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے
(بذریعہ ٹیپ)
سیمنار ہال - سندھ اسمبلی بلڈنگ

لائل پور میں
ہر جمعہ ۴ بجے شام
(بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزم طلوعِ اسلام - راجہ چوک ریل بازار

جلالپور جٹاں میں
ہر جمعرات ۷ بجے شام
(بذریعہ ٹیپ)
دفتر ادارۂ خدمتِ خلق۔

سوشلزم

اسلامی سوشلزم

اور ——— اسلام

سوشلزم

اسلامی سوشلزم — اور — اسلام

زندہ قوموں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی وحدتِ جامعیت چند اصول ہوتے ہیں جن پر ان کی اجتماعی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ (انہی اصولوں کے مجموعہ کو اس قوم کی آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے)۔ ان اصولوں کا مفہوم بالکل واضح اور متعین ہوتا ہے جسے اس قوم کا ہر فرد اچھی طرح سے سمجھتا ہے۔ اگر اس قوم کا ایک فرد قطب شمالی میں ہو اور دوسرا جنوبی افریقہ میں، اور آپ ان سے الگ الگ اُن کے کسی اصول کے متعلق بات کریں، تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا جواب یکساں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر و نظر کی یہی یکسانیت ہے جس سے افراد کے منتشر ذرے ایک جیتی جاگتی قوم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جب اس قوم سے زندگی کی حرارت ختم ہو جاتی ہے تو جس طرح اس کے افراد چلتی پھرتی لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں، اسی طرح اس کے اصولوں کے الفاظ تو بجنسہٖ موجود ہوتے ہیں لیکن ان کا متعین مفہوم باقی نہیں رہتا۔ ہر فرد ان کا الگ الگ مفہوم لیتا اور انہیں جداگانہ معانی پہناتا ہے۔ اس وقت ہماری قوم کی بعینہٖ یہی حالت ہو چکی ہے۔ اسلام نے اپنے اصولوں کا متعین مفہوم دیا تھا۔ اور اسی سے افراد کے منتشر ذرات "امتِ واحدہ" میں تبدیل ہو گئے تھے۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ قوم کے جس قدر افراد ہیں، اسلام کی بھی اسی قدر تعبیریں ہیں۔ کسی ایک کا اسلام، دوسرے کے اسلام سے نہیں ملتا۔ آج کل ہماری اس پریشانیٔ فکر و نظر کا بین مظاہرہ، اس سوال کے جواب میں سامنے آتا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ اسلام، نظام سرمایہ داری کا حامی ہے۔ دوسری طرف سے نعرہ بلند ہوتا ہے کہ اسلام کی رُو سے سرمایہ داری حرام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام سوشلزم ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ سوشلزم اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ "حکمتِ عملی" کے قائل پکارتے ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام نہ سرمایہ داری ہے، نہ سوشلزم۔ اس کا الگ اپنا نظام ہے ـــــ لیکن یہ نظام

کیا ہے اسکا کوئی متعین جواب ان کے ہاں سے بھی نہیں ملتا۔

آجکل دنیا میں سوشلزم کا چرچا ہے۔ جو ملک اس نظام کے مؤید ہیں ان کے سامنے اس نظام کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ لیکن ــــ ہمارے ہاں کی کانِ نمک میں پہنچکر یہ اصطلاح بھی خود نمک بن گئی ہے ــــ چنانچہ جس طرح ہمارے ہاں اسلام کے معاشی نظام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم نہیں اسی طرح سوشلزم کا بھی کوئی متعین تصور سامنے نہیں لایا جاتا۔ پھر ایک گروہ یہاں خالص سوشلزم کا حامی ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ نہیں، ہمارا مسلک "اسلامی سوشلزم" ہے۔ لیکن اس کی وضاحت ان کی طرف سے بھی نہیں کی جاتی کہ سوشلزم کیا ہے ــــ اسلامی سوشلزم سے کیا مراد ہے، اور اسلامی سوشلزم کس طرح غیر اسلامی سوشلزم سے متمیز ہے۔ آیئے ہم آج کی نشست میں یہ دیکھیں کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے اور یہ کس حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں اور کس حد تک متنافر۔ ہم کوشش کرینگے کہ فنی اصطلاحات اور فلسفیانہ مباحث میں الجھے بغیر عام فہم الفاظ میں بات کی جائے تاکہ وہ ہر ایک کی سمجھ میں آجائے۔

۱۔ اسلامی نظامِ حیات

اسلامی نظامِ حیات کے بنیادی خصائص حسب ذیل ہیں:۔

(۱) انسان کی زندگی حیوانات کی طرح محض طبیعی زندگی (PHYSICAL - LIFE) نہیں جو طبیعی قوانین کے تابع چلتی ہے اور انہی قوانین کے مطابق، ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ انسان کو اس کے طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی عطا کی گئی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات طبیعی قوانین کے تابع نہیں۔ اسلئے یہ جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ موت کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے چلتی ہے۔

(۲) ہر انسانی بچہ کو انسانی ذات یکساں طور پر ملتی ہے لیکن یہ ہوتی ہے غیر نشوونما یافتہ ــــ (UN - DEVELOPED)۔ انسانی زندگی کا مقصد اس ذات کی نشوونما ہے۔

(۳) زندگی کی موجودہ سطح پر انسانی ذات کی نشوونما جسم کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جسم بھی نشوونما یافتہ ہو۔

(۴) انسانی جسم کی نشوونما قوانین طبیعی کے تابع ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان غیر متبدل

اصولوں کے مطابق ہوتی ہے جنہیں مستقل اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے

(۵) طبیعی قوانین (جنہیں قوانین فطرت بھی کہا جاتا ہے) انسانی تجربہ اور مشاہدہ کی رُو سے سائنٹفک طریق سے معلوم کئے جا سکتے ہیں لیکن مستقل اقدار، وحی کی رُو سے عطا ہوتی ہیں اور وحی رسولوں کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتی ہے۔ یہ اقدار اس وقت قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں

(۶) مستقل اقدار کا تعلق تو انسان کی ذات ہی سے ہے لیکن چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) انسانی ذات کی نشو ونما خارجی دنیا کے اندر رہتے ہوئے ہی ہو سکتی ہے اس لئے قرآن کریم نے اس کے لئے بھی کچھ قواعد وضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ ان قواعد وضوابط کا تعلق معاشی نظام۔ سیاسی نظام۔ تمدنی نظام۔ معاشرتی نظامِ حیات وغیرہ سے ہے۔ جب یہ نظامہائے حیات قرآن کے متعین کردہ قواعد وضوابط کے مطابق متشکل ہوتے ہیں تو اس سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو مستقل اقدار کے بروئے کار آنے کے لئے سازگار ہوتا ہے۔ اس سے انسانی حیاتِ اجتماعیہ بھی مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے اور افراد کی ذات کی نشو ونما بھی بطریقِ احسن ہوتی جاتی ہے۔

(۷) تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگرچہ معاشی نظام (یا سیاسی، تمدنی وغیرہ نظاموں) کا تعلق (بظاہر) انسان کی طبیعی زندگی سے ہے لیکن اسلامی نظامِ حیات میں ان کا گہرا تعلق، انسان کی داخلی زندگی (یعنی اس کی ذات کی نشو ونما) سے بھی ہوتا ہے۔ یہ مفہوم ہے اس نظریہ کا کہ اسلام میں دین اور دنیا (یا الفاظ عام مذہب اور سیاست) الگ الگ نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ روٹی، جائز طریق سے حاصل کی گئی ہو یا ناجائز طریق سے، اس سے انسانی جسم کی پرورش بہرحال ہو جائے گی۔ لیکن جائز طریق سے حاصل کردہ روٹی سے (یعنی اس معاشی نظام کی رُو سے حاصل کردہ سے جو قرآن کے متعین کردہ قواعد وضوابط کے مطابق متشکل ہو) انسانی جسم کی بھی پرورش ہو جائے گی اور اس کی ذات کی نشو ونما بھی۔ لیکن ناجائز طریق سے حاصل کردہ روٹی سے انسان کے جسم کی پرورش تو ہو جائے گی لیکن اس کی ذات میں نشو ونما کے بجائے ضعف اور اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں مختلف نظام (معاشی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی) قرآنِ کریم کی متعین کردہ حدود کے مطابق متشکل ہونے چاہئیں۔ ان میں سے معاشی نظام، سردست، ہمارے زیرِ نظر ہے۔

اسلام کا معاشی نظام

اسلام کے معاشی نظام کا ملخص یہ ہے کہ

کرۂ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو[1] (۱۱/۶)

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانوں کے متعلق جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لی ہیں وہ اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو خدا کے پروگرام کو پورا کرنے کے لئے متشکل کیا جاتا ہے — اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے دائرے میں بسنے والے تمام افراد کے رزق کی ذمہ داری اس مملکت پر عاید ہوتی ہے۔ اسی لئے اس مملکت کو اعلان کرنا ہوتا ہے کہ

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی — (۶/۱۵۲)

رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس پر انسانی زندگی اور اس کی نشوونما کا مدار ہے۔ اس قسم کے معاشرہ کو خدا نے (استعارۃً) "جنتی زندگی" سے تعبیر کیا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اس میں تمہیں روٹی۔ کپڑے۔ مکان (وغیرہ) کی ضمانت حاصل ہوگی۔ (۲۰/۱۱۸)

اس انداز سے کہ

اس میں تم جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھا سکتے ہو۔ (۲/۳۵)

ذرائع رزق پر ملکیت

ظاہر ہے کہ مملکت ایسی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک ذرائع پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ دنیا میں بنیادی ذریعۂ رزق ارض (زمین) ہے۔ اس میں سے خوراک بھی نکلتی ہے اور وہ تمام خام اشیاء بھی جن پر صنعت و حرفت (INDUSTRY) کا دارومدار ہے۔ ارض کے متعلق قرآنِ کریم میں بے شمار مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ اس پر صرف "خدا کی ملکیت" ہے۔ اور کسی ایک جگہ بھی نہیں کہا گیا کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت ہو سکتی ہے۔ اسے "ارض اللہ" (اللہ کی زمین) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (۴/۹۷)۔ اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ

(۱) اس میں انسانوں اور ان کے مویشیوں کے لئے روزی کا سامان ہے۔ (۷۹/۳۳ ; ۸۰/۳۲)

---

[1] چونکہ یہ تمام آیات 'طلوعِ اسلام' میں سینکڑوں مرتبہ پیش کی جا چکی ہیں' اس لئے (بغرضِ اختصار) اس مقالہ میں ان کے ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قارئین' اصل آیات' قرآنِ کریم کے کسی نسخہ سے خود دیکھ لیں۔ حوالہ کے لئے' اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔ واضح رہے کہ ترجمہ' اصل آیات کا بدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن اپنے الفاظ میں قرآن ہے۔

(۲) بندوں کے لئے رزق ہے ۔ (۵/۱۱)

(۳) اسے پیدا ہی انسانوں کے فائدے کے لئے کیا گیا ہے ۔ (۵۵/۱۱)

(۴) اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے ۔ (۴۱/۱۰)

اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ زمین کا انتظام اس طرح کرے کہ اس سے تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست میسر آسکے ۔

دولت کا نظام

دولت (روپیہ پیسہ) کی ذاتی حیثیت (INTRINSIC VALUE) کچھ نہیں ۔ یہ سامانِ زیست کے حصول اور تقسیم کا ایک تمدنی ذریعہ ہے، جسے انتظامی سہولت کے لئے وضع اور اختیار کیا گیا تھا ۔ قرآن نے اسے یہی حیثیت دی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب دولت معاشرہ میں گردش میں رہے (دولت کے لفظی معنی بھی یہی ہیں) ۔ اگر دولت روک لی جائے (جسے جمع کرنا کہتے ہیں) تو یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے قرآن نے دولت جمع کرنے کو سنگین جرم قرار دیا ہے ۔ سورۃ المعارج میں ہے ۔

جہنم آوازیں دے دیکر بلا رہا ہے اُسے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے گرہ باندھ کر رکھ چھوڑتا ہے ۔ (۷۰/۱۷-۱۸)

دوسری جگہ ہے ۔

تباہی ہے اس کے لئے ..... جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے ۔ یہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہے کہ اس کی دولت اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گی ۔ نہیں ۔ بلکہ یہ اسے تباہی کے جہنم میں جا گرائے گی ۔ (۱۰۴/۱-۴)

سورۃ توبہ میں ہے ۔

جو لوگ چاندی سونا جمع کرتے رہتے ہیں اور اس دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے، اے رسول! تو انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیدے جس دن ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے دبا رکھا تھا ۔ سو اب ان خزانوں (کی لائی ہوئی تباہی) کا مزہ چکھو ۔ (۹/۳۵)

یہاں سے یہ واضح ہے کہ دولت کو روک رکھنا سنگین جرم ہے ۔ دولت کو گردش میں رہنا چاہیئے ۔ لیکن قرآن نے اس باب میں بھی واضح کر دیا ہے کہ

دولت کو اس طرح گردش نہ دو کہ یہ محض دولت مند طبقہ ہی میں پھرتی رہے۔ (۵۹/۷)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کمائی میں سے کسقدر دولت اپنے لئے رکھے اور کس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے معاشرہ کی تحویل میں دیدے۔ اس کے لئے قرآن نے اصول یہ دیا ہے کہ۔

اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کسقدر مال دوسروں کے لئے دے دیں۔

ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے 'سب کا سب۔ (۲/۲۱۹)

"ضروریات" دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک بنیادی ضروریات (کھانا۔ پینا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) ان چیزوں کی ضرورت سب کو پڑتی ہے۔ دوسری' اضافی ضروریات۔ (مثلاً ایک ڈاکٹر کی ضروریات۔ یا انجنیئر کی ضروریات اپنے اپنے کام کے لئے)۔ اگر معاشرہ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات معاشرہ کی طرف سے پوری کر دی جاتی ہیں تو لوگوں کو اضافی ضروریات کے لئے روپیہ رکھنے کی اجازت ہو گی۔ اگر وہ بھی معاشرہ کی طرف سے پوری کی جاتی ہوں تو پھر کچھ بھی رکھنے کی اجازت نہیں ہو گی — یعنی اصول یہ ہو گا کہ جن ضروریات کو معاشرہ از خود پورا نہیں کرتا اس حد تک افراد' اپنے پاس رکھ کر' باقی سب دولت معاشرہ کی تحویل میں دے دینگے۔ اس طرح فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہے گی۔

اب ظاہر ہے کہ جب

(۱) ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہیں گے۔ اور

(۲) فاضلہ دولت کسی کے پاس رہیگی نہیں۔

تو نظامِ سرمایہ داری کا از خود خاتمہ ہو جائیگا۔

اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص کو معلوم ہو کہ وہ خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے اسے اتنا ہی ملے گا جتنے میں اس کی ضروریات پوری ہو جائیں' اس سے زاید سب' دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے کام آئے گا' تو وہ زیادہ محنت کرے گا ہی کیوں؟ — یہ وہ مقام ہے جہاں قرآنی آئیڈیالوجی کام کرنے کا جذبہ محرکہ پیدا کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنی آئیڈیالوجی کی رُو سے انسانی زندگی کا فریضہ' انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے' ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص' دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتا ہے' اتنی ہی اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے — سورۃ اللیل میں ہے کہ تباہی سے وہ بچتا ہے

جو اپنا مال اس لئے دیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ (۹۲/۱۸)

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں اس حقیقت کو متنوع انداز سے سامنے لایا گیا ہے۔ یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس کی رُو سے ایک مردِ مومن نہایت جانفشانی سے محنت کرتا ہے اور اپنی محنت کے ماحصل سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے بطیبِ خاطر دے دیتا ہے۔ اس کی محنت کے ماحصل کو کوئی دوسرا اس سے لیتا نہیں۔ اسے کوئی غصب نہیں کرتا۔ اس سے کوئی زبردستی نہیں چھینتا۔ وہ ازخود، دل کی پوری رضامندی سے، اسے معاشرہ کی تحویل میں دے دیتا ہے کہ اس سے دوسروں کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ بلکہ وہ اکثر اوقات دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ (۵۹/۹) حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی زندگی کا تو آغاز ہی اس معاہدہ سے ہوتا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ

اللہ مومنین سے ان کا جان اور مال جنّت کے عوض خرید لیتا ہے۔ (۹/۱۱۱)

یعنی مسلمان کی نہ جان اپنی ملکیت ہوتی ہے نہ مال۔ اس نے یہ سب کچھ "خدا کے ہاتھوں" بیچ دیا ہوتا ہے — اور خدا سے عملاً مقصود ہوتی ہے وہ مملکت جو خدا کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلامی مملکت افراد سے ان کی محنت کی فاضلہ کمائی زبردستی چھین لیتی ہے۔ وہ مندرجہ بالا معاہدہ کی رُو سے اپنی فاضلہ دولت بطیبِ خاطر مملکت کے حوالے کر دیتے ہیں۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں قرآن کا معاشی نظام جس سے مقصود محض روٹی کا مسئلہ حل کرنا نہیں بلکہ اسے اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے جسم کی پرورش کے ساتھ، فرد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) بھی مستحکم ہوتی چلی جائے۔ جو تفاصیل اوپر دی گئی ہیں، وہ اس نظام کی آخری اور مکمل شکل کے خط و خال ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اپنے موجودہ نظام کو قرآنی نظام میں تبدیل کرنا چاہیں گے تو اس کی آخری منزل تک بتدریج پہنچیں گے۔ یہ جو قرآن میں صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ سے متعلق احکام ہیں، تو وہ اسی عبوری دور سے متعلق ہیں۔ جب یہ نظام اپنی آخری شکل میں قائم ہو جائے گا تو اس وقت صدقہ خیرات وغیرہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ اُس وقت نہ کوئی محتاج ہوگا اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت رہے گی۔ لہٰذا اُس وقت نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا اور نہ ہی ان جائیدادوں کو وراثت میں منتقل کرنے کا سوال۔ ہر ایک اپنی ضروریات کی طرف سے بے فکر اور مطمئن ہو کر اپنے اپنے فرائضِ مفوضہ کی سرانجام دہی میں مصروف ہوگا تاکہ عالمگیر انسانیت کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے اور یوں کاروانِ انسانیت آگے بڑھتا چلا جائے۔ قرآن نے، رسولؐ اللہ کی زندگی کو ہمارے لئے بہترین ماڈل (اسوۂ حسنہ) قرار دیا ہے اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ، قرآن کے معاشی نظام کے منتہیٰ کی جیتی جاگتی تصویر

تھی۔ آپؐ نے زندگی بھر نہ زاید از ضرورت ایک پیسہ تک اپنے پاس رکھا، نہ کوئی جائیداد کھڑی کی اور نہ ہی کچھ ورثہ میں چھوڑا۔ اسلامی نظام کے تابع تمام افراد کی زندگی اسی قسم کی ہوگی۔

(۰)

۲۔ سوشلزم

(اسلام کی طرح) کارل مارکس نے بھی زندگی کا ایک نظریہ پیش کیا۔ لیکن اس کا یہ نظریہ اسلام کے پیش کردہ نظریہ کے بالکل متضاد تھا۔ اس نے کہا کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی ہے۔ یہ طبیعی قوانین کے تابع سرگرم عمل رہتی ہے اور اس کے بعد انہی قوانین کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتی ہے اور پھر انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے اور اس کی ساری تاریخ اسی سوال کے گرد گھومتی ہے۔ اور جس قدر تصادمات رونما ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ معاشی نظام کے اختلافات ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کی اخلاقی اقدار بھی معاشی نظام کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ایک معاشی نظام ایک وقت تک کارفرما رہتا ہے۔ پھر آفرینشِ دولت کے طریقے (METHODS OF PRODUCTION) بدل جانے سے اس نظام کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک جدید نظام ظہور پذیر ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے اور اس جدید نظامِ معیشت کے ساتھ ہی معاشرہ کی تمام اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔ "نیکی" وہ ہے جو پیداوار کی فراوانی میں مدد دے۔ "برائی" وہ جو اس کی وسعتوں کی راہ میں حائل ہو۔

ظاہر ہے کہ اس نظریۂ زندگی کی رُو سے نہ خدا پر ایمان کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ وحی پر مبنی مستقل اقدارِ حیات کے تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس لئے مارکسی فلسفۂ زندگی میں خدا، وحی، رسالت، حیاتِ آخرت سب کا انکار ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ نہ اس فلسفۂ حیات کا ماننے والا مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی مسلمان اس فلسفۂ حیات کو قبول کر کے مسلمان رہ سکتا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ مارکسی نظریہ کی رُو سے ایک معاشی نظام اپنے انتہائی فروغ کے بعد رُو بہ تنزل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی جگہ ایک ایسا معاشی نظام لے لیتا ہے جو سابقہ نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس سے پہلے دنیا میں نظامِ سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ وہ اپنا دور ختم کر کے، رخصت ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا نظام ظہور پذیر ہو رہا ہے جو اس نظامِ (سرمایہ داری) کی ضد ہے۔ اس نئے نظام میں وسائل پیداوار سرمایہ داروں کی انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت میں آجائینگے اور اس طرح

معاشرہ میں طبقاتی تفریق باقی نہیں رہے گی۔ حتےٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ انسانی معاشرہ میں حکومت کا وجود بھی نہیں رہے گا۔

مارکس کے نزدیک اس آخری منزل کا نام کمیونزم ہے۔ لیکن اس (آخری منزل) تک پہنچنے کے لئے ایک عبوری منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم کا فلسفۂ حیات تو ایک ہی ہے فرق صرف معاشی نظام کے تدریجی مرحل کا ہوتا ہے۔ سوشلزم میں، ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ کمیونزم میں ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے لیکن دیا اس کی ضرورت کے مطابق جاتا ہے۔ وسائلِ پیداوار دونوں میں، انفرادی ملکیت کے بجائے مملکت کی ملکیت میں آجاتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایک ہے سوشلزم کا فلسفۂ حیات اور دوسرا ہے اس کا معاشی نظام۔ لیکن جس طرح اسلام اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح سوشلزم کے فلسفۂ حیات کو اس کے معاشی پروگرام سے الگ نہیں کیا جاتا۔ ان دونوں کے مجموعہ (بلکہ امتزاجی مرکب) کا نام سوشلزم (یا آگے چل کر کمیونزم) ہے۔

مغربی ممالک میں سے بیشتر میں تو مذہب ختم ہی ہو چکا ہے۔ لیکن جہاں مذہب کا نام باقی ہے، وہاں بھی اس کی حیثیت ایک پرائیویٹ عقیدہ کی سی ہے جسے دنیاوی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں (اسے سیکولر نظامِ مملکت کہا جاتا ہے)۔ یورپ کے بعض ممالک نے، سوشلزم کو بعد اس کے فلسفۂ حیات کے اختیار کر لیا ہے اور بعض نے اس کے صرف معاشی پروگرام کو (کلی نہیں تو جزوی طور پر) قبول کر لیا ہے اور مذہب کو اسکی پرائیویٹ حیثیت سے باقی رہنے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہاں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ اوّل تو ان کے ہاں مذہبی بنیادوں پر کوئی فلسفۂ حیات ہے ہی نہیں۔ اور اگر کہیں کچھ ہے بھی تو اس کا معاشی (یا سیاسی) نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی حیثیت محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی سی ہے جس کی عملی شکل چند رسوم کی ادائیگی تک محدود ہے۔ اسے ثنویت یا (DUALISM) کہا جاتا ہے۔ یعنی گرجا کی چار دیواری کے اندر مذہب اور اس کے باہر دنیاوی امور

(۰)

۳۔ اسلامی سوشلزم

سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ۔

(۱) سوشلزم کا فلسفۂ حیات، قرآنی فلسفۂ حیات کے یکسر متضاد ہے اور وہ کسی مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ــــ البتہ

(۲) سوشلزم کا معاشی نظام جس کی رُو سے ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت کے بجائے مملکت کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ایک حد تک قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ (قرآن کا معاشی نظام اس سے بھی بہت آگے جاتا ہے) ــــ لیکن

(۳) سوشلزم کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جب "سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جائے گی تو اس سے مراد مارکسی فلسفۂ حیات اور اس کا معاشی پروگرام دونوں ہونگے۔

اس کے برعکس، جو مذہب اس وقت بالعموم اسلام کے نام سے متعارف ہے، اس کے علمبردار، نظامِ سرمایہ داری کے حامی ہیں اور سوشلزم کے معاشی پروگرام کے سخت مخالف۔ ہم اس وقت، اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کے معاشی نظام کے علی الرغم، اس قسم کا سرمایہ دارانہ نظام کس طرح اسلامی نظام تصور کر لیا گیا۔ ہم سردست صرف واقعاتی حقیقت (FACTUAL POSITION) تک محدود رہنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں مذہب کے علمبردار نظامِ سرمایہ داری کے حامی ہیں اور (بدقسمتی یہ کہ) اسے عین اسلامی قرار دیتے ہیں۔ ان کا اعلان یہ ہے کہ

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ (یعنی ۲½ فیصد زکوٰۃ ــــ ناقل) بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء۔ مکانات۔ سواری۔ (زمین وغیرہ) غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ (مسئلہ ملکیتِ زمین۔ از ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحہ ۷۳ ن ۵۷)

ان کا فتویٰ یہ ہے کہ

> ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے .... اس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۷)

مسلمانوں میں جو لوگ نظامِ سرمایہ داری کے انسانیت سوز نتائج سے واقف ہیں اور مفلس اور مظلوم انسانوں کا دل میں درد رکھتے ہیں، وہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے جو

لوگ قرآنی نظامِ معیشت پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جو معاشی نظام پیش کیا جاتا ہے' اسے حقیقی اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کی جگہ صحیح قرآنی نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس میں فلسفۂ حیات اور معاشی پروگرام دونوں (سوشلزم کے بجائے) اسلامی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جن کے سامنے قرآن کا معاشی پروگرام نہیں' ان کی نگاہیں' لامحالہ سوشلزم کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہی "ازم" اس وقت نظامِ سرمایہ داری کی مخالف ہے۔ یہ لوگ سوشلزم کی طرف دعوت دیتے ہیں تو مذہب پرست طبقہ، جھٹ سے سوشلزم کا فلسفہ حیات سامنے لے آتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ بتاؤ! کیا وہ نظام جس میں خدا۔ رسول۔ وحی۔ آخرت' سب سے انکار ہو' تم قبول کر لوگے؟ اب ظاہر ہے کہ وہ کون سا مسلمان ہے جو اس نظام کو اپنے لئے قابلِ قبول قرار دے گا؟ مسلمانوں کے ممالک میں' اس وقت سوشلزم کے حامیوں اور مذہب پرست طبقہ میں' یہ تصادم بڑی شدت سے کارفرما ہے اور اب یہ سلسلہ پاکستان میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ سوشلزم کے حامیوں کا طبقہ نوجوانوں (اور وہ بھی بالعموم' طالب علموں) پر مشتمل ہوتا ہے ـــــ انقلابی روح ہوتی ہی نوجوان طبقہ میں ہے ـــــ وہ جب دیکھتے ہیں کہ مذہب پرست طبقہ' نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے' تو مارکس کے یہ الفاظ' جلی حروف میں ابھر کر' ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں کہ۔

> مذہب' انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ انسان' مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے یا جس نے اس مقام کو پا کر پھر سے اسے کھو دیا ہے۔ مذہب' مظلوموں کی سسکیاں، ایک بے حس دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جس میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعات' اور دیگر تمام تصورات' سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں ـــــ مذہب انسانوں کے لئے افیون کا حکم رکھتا ہے۔

اور جب مذہب پرست طبقہ اپنی مخالفت میں اور متشدد ہو جاتا ہے اور انہیں "شریعت" کے نام پر مطعون کرتا ہے' تو وہ اس کے ردِعمل کے طور پر' لینن کے یہ الفاظ' بآوازِ بلند دہرا دیتے ہیں کہ۔

> ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ پارٹی کے مفاد کی جنگ کے تابع ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے

خلاف اور مزدوروں کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عین اخلاق ہے
..... چنانچہ پارٹی کے مفاد کی خاطر، جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی،
عین حق و صداقت ہے — نہیں! بلکہ مخالفین کے خلاف کذب و افترا ہی
بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔

اُدھر سے مذہب پرست طبقہ اپنے حواریوں کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ

راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے۔ اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

اور عوام کو یہ کہہ کر فریب دیا جاتا ہے کہ یہ جھوٹ چونکہ اسلام کے فروغ کے لئے بولا جاتا ہے، اسلئے ایسا کرنا از روئے شریعت جائز ہی نہیں بلکہ "جہادِ عظیم" ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ کشمکش جو اس وقت سوشلزم کے حامیوں اور نظامِ سرمایہ داری کے موید بین میں مذہب کے نام پر جاری ہے۔ چونکہ ہمارے ملک کی بکثرت آبادی مذہب کی معتقد ہے اس لئے اس کا مذہبی پیشوائیت کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو جانا فطری امر ہے۔ اس مقام پر سوشلزم کا حامی طبقہ شکست کھا جاتا ہے۔

اس صورتِ حال سے بچنے کی خاطر "اب" اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اختیار کی جا رہی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو حضرات اس اصطلاح کو اختیار کر رہے ہیں، وہ سب کے سب، اسے بطور ایک سیاسی حربہ کے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دل سے چاہتے ہیں کہ وہ مسلمان رہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس وقت تک وضاحت سے ایسا نہیں کہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف سوشلزم کا معاشی نظام اختیار کرنا چاہتے ہیں — اس کا فلسفۂ حیات ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ مذہب کا وہی تصور ہے جو مغربی ممالک میں پایا جاتا ہے۔ یعنی عقیدہ مذہب کا اور نظامِ زندگی دوسروں سے مستعار لئے ہوئے۔ ان کے اس اعتراض کو اس سے بھی تقویت حاصل ہو جاتی ہے کہ اسلامی سوشلزم کے حامی، ایک سلک ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ (۱) ہمارا مذہب اسلام ہے (۲) ہماری سیاست جمہوریت۔ اور (۳) ہماری

معیشت' سوشلزم ـــ یہ اعلان' اسی ثنویت (DUALISM) کی صدائے بازگشت ہے جو مغرب میں سیکولرازم کے نام سے مشہور ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقی اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی ـــ مذہب پرست طبقہ اس سے بھی فائدہ اٹھا کر' سوشلزم کی مخالفت (یعنی نظامِ سرمایہ داری کی حمایت) کرتا ہے۔

اس کشمکش میں اندیشہ یہ ہے کہ

(۱) اگر سوشلزم کا حامی (نوجوانوں کا) طبقہ غالب آگیا تو وہ' مذہب پرست طبقہ کی مخالفت کے انتقام کے طور پر' سوشلزم کو بمعہ اس کے فلسفۂ حیات کے اپنا لیگا ـــ بالخصوص اس لئے بھی کہ ان کے سامنے مذہب کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے وہ نظامِ سرمایہ داری و جاگیرداری کا پشت پناہ ہے جس کے ساتھ سوشلزم کے حامی کبھی مفاہمت نہیں کر سکتے ـــ ویسے بھی' جب کسی بھوکے کے سامنے یہ سوال آئیگا تو وہ جماعتِ اسلامی کے پیش کردہ "اسلام" کے مقابلہ میں' "سوشلزم کے کفر" کو یقیناً ترجیح دیگا۔

(۲) اگر مذہب پرست طبقہ ... غالب آگیا تو یہاں سرمایہ داری کا انسانیت کُش نظام اسطرح مسلط ہو جائے گا کہ اس کے استیصال کے لئے نہ معلوم کتنا عرصہ لگ جائے' اور وہ بھی خدا جانے' کس قدر خون خرابے کے بعد ہو۔

جو لوگ نظامِ سرمایہ داری کے مخالف اور حقیقی اسلام کے احیاء کے متمنی ہیں' وہ اس صورتِ حالات سے جس قدر لرزہ براندام ہو سکتے ہیں' واضح ہے۔ یہی وہ شدتِ احساس تھی جس کے پیشِ نظر ہم نے "اسلامی سوشلزم" کے حامیوں کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ جب "سوشلزم" کے تصور میں اس کا فلسفۂ حیات ساتھ آتا ہے' اور مذہب پرست طبقہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے' تو وہ اس اصطلاح کے استعمال پر مُصر نہ ہوں۔ انہیں' خود اپنے مقصد کی کامیابی اور حقیقی اسلام کے احیاء کے لئے' اس اصطلاح کو ترک کر دینا چاہیئے۔

اس کے جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اصطلاح اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے بھی تو استعمال کی تھی ـــ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے سرراہے یہ الفاظ استعمال کئے تھے (علامہ اقبالؒ نے سوشل ڈیماکریسی اور قائدِ اعظمؒ نے اسلامک سوشلزم کہا تھا)۔ لیکن اوّل تو اس وقت اس قسم کے سوالات سامنے آئے ہی نہیں تھے۔ جو اس وقت موضوعِ بحث بنائے جا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اپنے خیالات کی جو وضاحت کی تھی، اس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی تھی کہ ان الفاظ سے ان کا حقیقی مقصد کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ "بالشوزم جمع خدا" اسلام کے مماثل ہو جاتا ہے' تو اس میں "خدا" سے مراد مغرب کے سیکولر نظام والا خدا نہیں تھا جس کا دائرہ خدائی' گرجا یا مسجد کی چار دیواری تک محدود ہوتا ہے۔ اس سے وہ

خدا مراد تھا جس کے عطا کردہ نظامِ زندگی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (اقبالؒ)

انہوں نے سوشلزم کے فلسفۂ حیات کی تردید ان کھلے الفاظ میں کر دی تھی۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور مجھے افیون تصور کرتے ہیں ..... میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مرونگا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے ..... باقی رہا سوشلزم۔ سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (خواجہ غلام السیدین کے نام مکتوب)

قائداعظمؒ نے (۱۹۴۱ء میں) حیدرآباد (دکن) میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ:۔

اشتراکیت، بالشویت، یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک درحقیقت اسلام اور اسکے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

اور انہوں نے اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقع پر جولائی ۱۹۴۸ء میں فرمایا تھا کہ:۔

ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحال اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکینگے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے۔ اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکینگے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا۔ اور نوعِ انسانی کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

ہم "اسلامی سوشلزم" کے مدعیان سے ایک بار پھر گزارش کرینگے کہ وہ وقت کی نزاکت کا احساس کریں اور محض الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر ایسے مفید انسانیت مقصد کو نقصان نہ پہنچائیں جسے لے کر وہ میدان میں اترے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامی 'مذہب کے نقاب میں' اس اصطلاح کو آگے بڑھا کر' عوام کو گمراہ اور مشتعل کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے جذباتی اصرار کی وجہ سے ان کے اس حربہ کو آگے بڑھنے دیا تو اگر آپ

آخرالامر کامیاب بھی ہو گئے تو بھی اس بدقسمت ملک میں وہ خون خرابہ ہو گا جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔
جب آپ سچے مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو واضح الفاظ میں اس قسم کا اعلان کرنا چاہیئے کہ:-

ہمارا مقصد پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کا احیاء اور فروغ ہے جس کا معاشی نظام یہ ہے کہ

(۱) مملکت کا کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔

(۲) ذرائع پیداوار (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا انڈسٹری کی صورت میں) انفرادی ملکیت کے بجائے، ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔ اور

(۳) فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔

یہ اس معاشی نظام کا منتہیٰ ہے جس تک، بہ تقاضائے حالات، بتدریج پہنچا جائیگا اور اس کے لئے کوئی غیر قرآنی طریق اختیار نہیں کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ "اسلامی سوشلزم" کے حامی ہوں یا کوئی اور۔ جو بھی اس مقصد کو لے کر اٹھے گا وہی اسلام کا سچا بہی خواہ ہو گا اور اسی کے سامنے فلاح اور سعادت کے دروازے کھلیں گے۔ پاکستان ہی نہیں، بلکہ عالم اسلام کی تاریخ میں موجودہ لمحات بڑے ہی نازک ہیں۔ اس وقت، ایک غلط قدم، معلوم، کاروانِ ملت کو اس کی صحیح منزل سے کسقدر دور لے جائیگا۔ اس وقت، امین و صادق میرِ کاروان وہی ہو گا جو جذبات سے بلند ہو کر حقائق کا اتباع کرے اور اس طرح اس قافلہ کو اس کی اس منزلِ مقصود تک لے جائے جسکی نشاندہی قرآنِ کریم نے، نہایت واضح اور درخشندہ انداز سے کر رکھی ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

شاہد عادل

جماعتِ اسلامی اور علماء

پچھلے چند برسوں سے جماعتِ اسلامی کیطرف سے طبقہ علماء کو اپنے زیرِ اثر لانے کے لئے جو انتھک کوششیں ہو رہی ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ان کے پسِ منظر میں جھانک کر دیکھا جائے تو انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ ـــ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ـــ وہ سوچتا ہے کہ وہی طبقہ علماء جو ان حضرات کے فیصلہ کے مطابق "اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا" کس طرح ان کا ہم نوا ہو جانے کے بعد "حق پرست علماء کا گروہ" بن جاتا ہے۔ وہ درسِ نظامی جس میں ان کی تحقیق کے مطابق "آٹے میں نمک کے برابر بھی دین نہ تھا" اور جو علماء اسے حاصل کرتے تھے وہ اپنے اردگرد دو سو برس پرانی فضا قائم کر لیتے تھے اور جس کی وجہ سے وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے یکایک "ٹھوس علمی قابلیت" پیدا کرنے کا نصاب بن جاتا ہے۔ وہ لوگ جن کی نظروں میں درسِ نظامی کی درس گاہیں تو کجا "ندوۃ العلماء" تک نہیں جچتا تھا، آج نہ صرف اپنے زیرِ اثر آنے والی درسِ نظامی کی درس گاہوں کی فہرستیں شائع کر رہے ہیں، بلکہ "انصاف پسند مفتیوں" کے زیرِ نگرانی درسِ نظامی کی اپنی درس گاہیں قائم کر رہے ہیں۔ وہ علماء جنہیں اراکینِ جماعت کے مشورہ کے باوجود امیرِ جماعتِ اسلامی براہِ راست خط و کتابت کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ آج جماعتِ اسلامی کی طرف سے ان کے لئے ایک خصوصی ادارہ "اتحاد العلماء" قائم کیا جا چکا ہے۔ ائمہ فقہ کی جس تقلید کو "گناہ سے بڑھ کر" یعنی کفر بتایا جاتا تھا، آج خود جماعتِ اسلامی اسکی علمبردار بن چکی ہے۔ حنفی فقہ کی معتبر ترین کتابیں جن کے متعلق "استہزاء" کہا جاتا تھا کہ قیامت کے دن یہ کسی کو پناہ نہ دیں گی، آج انہیں کو ملک کا قانون قرار دینے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ وہ علماء جنہوں نے "حجروں کی تنگ دنیا" میں رہتے ہوئے اسلام کو "غیر متحرک" اور جامد مذہبیت میں تبدیل کر دیا تھا آج وہ ملتِ اسلامیہ کی تقدیر بدلنے والے قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ملک کے دور دراز کونوں میں خاموش تبلیغ کرنے والے علماء جو ان کی بارگاہ سے "بدھمت کے بھکشو" کا خطاب پا چکے تھے "اتحاد العلماء" کی فہرستوں کی زینت بننے لگے۔ اور وہ لوگ جن کے متعلق یہ فرمایا جاتا تھا کہ "جبوں اور عماموں میں سیاہ دل لپٹے ہوتے ہیں" آج "انبیاء

کے وارث" کے نام سے خطاب کئے جا رہے ہیں۔

قارئین اس قدر تضاد کو دیکھ کر یقیناً چونک اٹھے ہونگے۔ لیکن ذرا صبر سے کام لیجئے۔ ان تضادات کی تفصیل ہم ابھی آپ کی خدمت میں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کو پیش کرنے سے پہلے، ہم عام قارئین اور خاص کر علماء حضرات کے غور و فکر کے لئے اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے مسلک میں ایسی حیرت انگیز انقلابی تبدیلی کچھ یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ ایسا خاص مقاصد کے ماتحت کیا گیا ہے۔ یہ مقاصد آئندہ صفحات میں علماء اور جماعتِ اسلامی کی کشمکش کی تفصیلات کے دوران خود بخود واضح ہوتے جائینگے۔ اس لئے انہیں ذرا غور سے دیکھئے۔ ہو سکتا ہے آپ کا غور و فکر اللہ کے کسی بندے کو ان حضرات کے دامِ تزویر کا شکار ہونے سے بچا لے۔ اور یہی ہماری اس قسم کی تحقیق و کاوش کا منتہیٰ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی تمام جماعتیں جنسِ کاسد ہیں

مولانا مودودی صاحب جس وقت سیاسی میدان میں اترے تو بدقسمتی سے قوم کی سربراہی کی تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی برتری کا سکہ جمانے کے لئے اس وقت کی جماعتوں کو جنسِ کاسد قرار دے دیا۔ یہ "تاریخی فیصلہ" انہی کی زبانی سنیئے۔ انہوں نے تحریر فرمایا۔

"اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں[1] یا علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین۔ دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔" (ترجمان القرآن۔ جلد ۱۷ عدد ۶ صفحہ ۴۹۲/۸۴)

اس جنسِ کاسد کی تھوڑی سی تفصیل انہی کی زبان سے سن لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

جُبّوں اور عماموں میں سیاہ دل

"پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے اٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے، کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں اور غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔ جمہور مسلمان بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف

---

[1] قائداعظم اور ان کے رفقاء سے مراد ہے۔

دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔"

(تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان۔ از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ صفحہ ۱۰۳)

علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں

لیکن اتنی سی بات کہہ دینے سے سربراہی کی کرسی تھوڑی مل جاتی ہے؟ اس کے لئے مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کو دیگر جماعتوں میں کیڑے ڈالنے کے لئے پوری طاقت سے جنگ کرنی پڑی۔ یہ جنگ علماء کے کسی ایک گروہ کے خلاف نہ تھی بلکہ ان کی ہر جماعت اس حملہ کی زد میں تھی۔ پہلے یہ ملاحظہ فرمایئے کہ ساری اسلامی دنیا کے علماء کے بارے میں جماعتِ اسلامی کی کیا رائے تھی۔ بات یوں ہوئی کہ علامہ موسیٰ جار اللہ (مرحوم) نے جماعتِ اسلامی والوں کو علمائے ہند کے بارے میں ایک مراسلہ بھیجا جو "ترجمان القرآن" میں چھپا۔ اس مراسلے کے نیچے مودودی صاحب کیطرف سے یہ نوٹ دیا گیا تھا۔

"علامہ نے ان سطور میں علمائے ہند کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ملامت و تحقیر کے وہ سزاوار ہیں۔ لیکن نہایت ادب کے ساتھ ہم اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علماء نہیں ہیں بلکہ اس باب میں تمام عالم اسلامی کے علماء کا حال یکساں ہے۔ ہر جگہ کے مدارس میں قرآن متروک و مہجور ہے۔ ہر جگہ اس گروہ میں انانیت، کبر، خود پرستی کی وہی بیماریاں ہیں جو علامہ کو یہاں کے علماء میں نظر آ رہی ہیں۔ علم و تحقیق کی خواہش اور اس کی قدر و حق شناسی بھی ہر جگہ مفقود و معدوم ہے۔ اور تبادلۂ افکار اور تعاونِ آراء کے ذریعے رفعِ نزاع اور تحقیق کی تمنا جو علامہ نے ظاہر فرمائی ہے اس کا بھی کہیں سراغ نہیں لگتا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کے علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے اور قدرت کیطرف سے ان جرائم کی جو سزا مقرر تھی وہ ان کو مل چکی۔" (ترجمان القرآن۔ جنوری، فروری ۱۹۴۵ء۔ صفحہ ۷۷)

صدیوں کے جمود کا نقصان

علماء کے جمود کی وجہ سے امت کو جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی نشاندہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ درحقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتداء ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے۔ آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی سمجھتے۔ مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ (مغربی) تہذیب اٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کارآمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے اور ان نئے کل پرزوں کو اصولِ اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی

زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہنچا تھا، اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علماء (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی۔ ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسولؐ خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں[1] میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانہ کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ وہ ہر معاملہ میں ان انسانوں[2] کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے۔ کہ ان کی بصیرت اوقات و حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔"

(تنقیحات۔ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب صفحہ ۲۷)

پروفیسر مولانا عبدالستار خیری

واضح رہے کہ ان سطور کی تحریر کے زمانے میں مودودی صاحب زیادہ نہیں تو کسی حد تک پروفیسر عبدالستار خیری کے ان خیالات سے متاثر تھے جن کا انہوں نے جرمنی میں تکمیل تعلیم کے بعد ہندوستان میں آکر اظہار کیا تھا۔ انہوں نے جرمنی سے واپسی کے بعد اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر جو خیری برادرس کے نام سے مشہور تھے، دہلی میں "جماعت اسلامی" کی بنیاد ڈالی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) کی کسی کتاب (غالباً "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک پر ایک نظر") کے دیباچہ میں یہ انکشافات فرمائے تھے کہ پروفیسر عبدالستار خیری جرمنی میں سوشلزم کی تحریک سے متاثر ہو کر آئے تھے۔ بہرحال انہوں نے جس "جماعتِ اسلامی" کی بنیاد ڈالی تھی مودودی صاحب بھی اس میں شریک تھے۔ لیکن موجودہ جماعت اسلامی والوں کا کہنا ہے کہ مودودی صاحب ان کے نظریہ "وحدتِ آمریت" سے اتفاق نہ کر سکے اس لئے جلد ہی علیحدہ ہو گئے۔ اور بعد میں مناسب وقت پر اپنی "جماعتِ اسلامی" کی بنیاد ڈالی۔ تاہم ایک تو انہوں نے نام بھی وہی رہنے دیا اور دوسرے کہا جاتا ہے کہ جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ بھی انہی اصولوں پر مرتب کیا۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، پاکستان بننے کے بعد کسی نے اعتراض کیا تھا کہ جماعت سے متعلقین کے جو تین درجے، یعنی رکن، ہمدرد اور متفق بنائے گئے ہیں یہ کمیونزم کے تنظیمی ڈھانچے سے لئے گئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ پھر تیسرا درجہ یعنی "متفقین" کو ختم کر دیا گیا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہم ان تفصیلات کو سامنے لا رہے تھے جن کی وجہ سے بقول جماعتِ اسلامی

---

[1] مراد حنفی فقہ کی کتابیں ہیں ۱۲ ۔ [2] مراد حنفی ائمہ ہیں ۱۲

علماء کے اردگرد دو سو برس پرانی فضا

علماء اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ "تنقیحات" سے جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے، اسی کے تسلسل میں مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

"بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے جس کی وجہ سے ابتداء میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا چاہے کرا لیجئے۔ لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کے بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اپنے اردگرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں سوچتے ہیں۔ اسی میں رہتے ہیں۔ اور اسی کے مناسب حال باتیں کہتے ہیں۔" (ایضاً۔ صفحہ ۲۸)

علماء نے اسلام کو جامد اور غیر متحرک بنا دیا ہے!

پھر اسی کتاب میں آگے چل کر (صفحہ ۱۱۸) پر لکھتے ہیں۔

"صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھوں میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی ساتویں ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی موقوف ہوگئی ہے۔ وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں تو یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانے کی تیزگی اور وقت کے سیلان و تجدد سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا۔ انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی۔ نئے تغیرات سے بے اثر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں۔ بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ لیں۔"

جمود کی خرابی کی جڑ

علماء کی اس روش کو بیان کرنے کے بعد مودودی صاحب اس چیز پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس تمام خرابی کی جڑ ہے۔

"اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی۔ اور ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اس اسلام قرار پا گئے عہ حالانکہ اسلام میں ان کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔ ملت اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت، پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد۔ لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو الٹ دیا گیا اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہل بصیرت کا اجتہاد، پھر سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور سب سے آخر میں قرآن۔ یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن و غیر متحرک شئے بنا دیا ہے..... مگر جب قرآن میں غور و تفکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی، جب آنکھیں بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی، جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا، جب کتاب و سنت سے براہِ راست اکتسابِ علم ترک کر دیا گیا اور جب کتاب و سنت کے اصول چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنا لئے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتہً رک گئی۔ اس کا قدم آگے پڑنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک ہو گئے۔ جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے۔ نئے نئے مذاہب نکالنے اور دور از کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے۔ اور اس دریا دلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر و فسق تقسیم کیا گیا کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ کی جگہ يَخْرُجُوْنَ مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا تماشہ دنیا نے دیکھا۔" (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

حجروں کی ننگ دنیا اور علماء کے مشاغل

پھر جون ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں "بے اصل فتنے" کے زیر عنوان علماء کے مشاغل کی جھلک یوں دکھلاتے ہیں :-

"یہ نمونہ ہے اُن فضول، لایعنی اور لاطائل جھگڑوں کا جن میں ہمارے بہت سے علماء دین اور بہت سے دیندار لوگ نہ صرف خود اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں بلکہ عام مسلمانوں کے ذہن کو بھی اس بری طرح سے اُلجھا رہے ہیں کہ ان غریبوں کو دین کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد پر غور کرنے کی

عہ حنفی فقہ کیطرف اشارہ ہے۔ ۱۲

فرصت ہی نہیں ملتی۔ ان لوگوں کی دنیا تنگ اور محدود ہے اور اس تنگ دنیا میں بیٹھے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی اور ساری دنیا کی فلاح کا مدار بس اس قسم کے سوالات پر ہے کہ حضرت مریمؑ کو گرمی کا میوہ جاڑے میں ملتا تھا یا نہیں اور لوہا حضرت داؤدؑ کے ہاتھ میں آتے ہی موم بن جاتا تھا یا نہیں۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ انہیں ان کے حجروں کی تنگ دنیا سے نکال کر خدا کی وسیع دنیا کا مشاہدہ کرایا جاتا اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہ حقیقی مسائل کون سے ہیں جن پر نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت کا انحصار ہے۔" (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صـ۱۳۰)

افسوسناک امر

اسی تحریر کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"سب سے بڑھ کر افسوسناک امر یہ ہے کہ ان مسائل میں مغز پاشی کرنے والے ایسے لوگ ہیں جو ہمارے دین کے عالم اور ملّتِ اسلامیہ کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ مسلمان ان کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ ان کے پاس سے دین کا علم ملے گا۔ دنیا ان کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ یہ اس دین کے نمائندے ہیں جسے محمد صلے اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ مگر اس اہم ذمہ دارانہ منصب پر متمکن ہو کر وہ اس قسم کے مسائل پر زبان و قلم کا زور صرف کر رہے ہیں جن کا چھوٹا سا نمونہ اوپر کے سوال میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ باتیں دیکھ کر مسلمان اور غیر مسلم سب اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اسلام کے مہمات مسائل یہی ہیں۔" (ایضاً۔ صـ۱۳۱)

علماء کا اہم مشغلہ کافر گری

"انہوں نے اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول بنائے بیٹھے ہیں جن کو انہوں نے خود یا ان کے اسلاف نے اپنے مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو نصوص سے معانی اخذ کرنے میں ان کے گروہ نے اختیار کی ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کا قرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی کھینچ اور تان اور بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کی یہ کافر گری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علماء کی طرف سے بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جن کی نمائندگی یہ علماء کرتے ہیں۔ روز بروز علماء کا اقتدار مسلمانوں پر سے اُٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل مذہب کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے دور بھاگتے ہیں۔ مذہبی مجلسوں اور مذہبی تحریروں کے متعلق یہ عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں فضول جھگڑوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صـ۱۵۲)

علماء اور فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل

"مگر عام طور پر علماء دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلافات کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کے جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا۔ معقولات کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن وحدیث سے نہ خود ذوق رکھا نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے لوگوں کی نگاہیں خوردبین بن کر رہ گئیں، دوربین و جہاں بین نہ بن سکیں۔ آج یہ پوری میراث جھگڑوں اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روز افزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کے ساتھ ہمارے حصہ میں آئی ہے۔"

(اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔ از مولانا مودودی صاحب۔ صفحہ ۲۲۷ ۔ ۲۲۸)

علماء میں جمود کی وجہ

علماء کا یہ طرز عمل تھا جس کی وجہ سے ان میں ذہنی جمود پیدا ہوا۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔

"اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علوم اوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظام تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرف آخر ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی علمی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردے چڑھائے جائیں۔ ان ہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنفین اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرسین مشغول رہے۔ کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیق، کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے قریب کی ان صدیوں میں ہمارے ہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔" (ایضاً صفحہ ۲۳۳)

درس نظامی میں آٹے میں نمک برابر بھی دین نہیں

قارئین خود اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس نظام تعلیم نے ہمارے علماء کو اس حالت تک پہنچا دیا ہو جماعت اسلامی کی طرف سے اس کے حق میں کیا کچھ نہ کہا گیا ہوگا چنانچہ انہوں نے، علماء کیخلاف مہم میں اس درسی نظام تعلیم کو بھی (جسے درس نظامی کہتے ہیں) خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ پہلے ملاحظہ ہو کہ ان کی تحقیق کے مطابق درس نظامی کی کتابوں میں دین کا حصہ کتنا ہے۔ نومبر ۱۹۵۱ء کے

ترجمان القرآن میں ہمیں ان کی یہ تحقیق ملتی ہے۔

"مولانا اس بد دماغی کی بھی تو خبر لیں جو مدتوں سے ہمارے دینی مدرسوں میں پرورش پا رہی ہے کہ نصاب کی چند کتابیں الٹی سیدھی پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو دین کا مختار کل سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں میں دین کا حصہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا آٹے میں نمک کا۔" (صفحہ $\frac{97}{25}$)

درس نظامی

اب علماء کے اس نظام تعلیم یعنی درس نظامی کی پوری تصویر انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:۔

"جہاں تک ہمارے پرانے نظام تعلیم کا تعلق ہے وہ آج سے صدیوں پہلے کی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس وقت یہاں انگریزی حکومت آئی اور وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے، اس وقت جو نظام تعلیم ہمارے ملک میں رائج تھا وہ ہماری اس وقت کی ضروریات کے لئے کافی تھا ..... لیکن جب وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے تو اس پورے نظام تعلیم کی افادیت ختم ہو گئی ..... اب جو لوگ اس نظام تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔"

(تعلیمات۔ از مولانا مودودی صاحب۔ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹)

درس نظامی کے فارغ التحصیل اسلام کے صحیح نمائندہ نہیں

مولانا کی یہ تقریر جو انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی، بڑی طول طویل ہے جس کا پورے کا پورا نقل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا مقصد زیر بحث کی وضاحت کے لئے اس میں سے ایک دو مزید اقتباسات دیئے جاتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"ان درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلباء۔ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں۔ اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا، کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی اس میں کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعہ سے ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بُعد بڑھتا جا رہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آ رہی ہے۔ پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک

سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ کیونکہ ان کی ضروریاتِ زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سرے سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔"

(ایضاً۔ صفحہ ۱۳۹-۱۴۰)

ان کی زبانوں میں ڈنک ہے

ان جھگڑوں میں علماء حضرات زبان کس قسم کی استعمال کرتے ہیں اسکے متعلق بھی مودودی صاحب کی تصریحات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لئے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اسکے لئے آپ کو علماء ہی کے طبقے کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور باستثناء چند اس طبقے کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیئے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی اسلئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اسکے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند نزاعی چھوٹی چھوٹی باتوں میں جمع ہوگئی ہیں۔ اس لئے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولیگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے گھر میں کالم گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی اور آخرکار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔" (تنقیحات صفحہ ۲۸)

اس کے بعد آپ پھر اسی درسِ نظامی کی طرف آیئے جس پر مودودی صاحب کی تنقید آپ کے سامنے آرہی تھی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں لکھا تھا۔

درسِ نظامی میں کیا پڑھایا جاتا ہے

"کوئی عربی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کے نصابِ تعلیم میں پورا قرآن مجید داخل ہو۔ صرف ایک یا دو سورتیں (سورۃ بقرہ یا سورۃ آل عمران) باقاعدہ درساً درساً پڑھائی جاتی ہے۔ باقی سارا قرآن اگر کہیں شاملِ درس ہے بھی تو صرف اسکا ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ تحقیقی مطالعہ قرآن کسی مدرسے کے نصاب میں شامل نہیں۔ یہی صورت حال حدیث کی ہے۔ اسکی بھی باقاعدہ تعلیم جیسی کہ ہونی چاہیئے، جیسی کہ محدث بننے کے لئے درکار ہے، کہیں نہیں دیجاتی۔ درسِ حدیث کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے وہ یہ ہے کہ جب فقہی اور اعتقادی جھگڑوں سے متعلق کوئی حدیث آجاتی ہے تو اس پر دو دو تین تین دن صرف کر دیئے جاتے ہیں۔ باقی رہیں وہ حدیثیں جو دین کی حقیقت سمجھاتی ہیں یا جن میں اسلام کا

معاشی اور سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی نظام بیان کیا گیا ہے' یا جن میں دستورِ مملکت یا نظامِ عدالت یا بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہے۔ ان پہلے استاد اور شاگرد دونوں اس طرح رواں دواں گزر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی بات قابلِ توجہ ہے ہی نہیں۔ حدیث اور قرآن کی بہ نسبت ان کی توجہ فقہ کی طرف زیادہ ہے لیکن اس میں زیادہ تر بلکہ تمام تر جزئیات فقہ کی تفصیلات ہی توجہات کا مرکز رہتی ہیں۔ فقہ کی تاریخ، اس کے تدریجی ارتقاء، اسکے مختلف اسکولوں کی امتیازی خصوصیات' ان اسکولوں کے متفق علیہ اور مختلف فیہ اصول اور ائمہ مجتہدین کے طریق استنباط جن کے جانے بغیر کوئی شخص حقیقت میں فقیہہ نہیں بن سکتا، ان کے درس میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان چیزوں پر شاگرد تو درکنار استاد بھی نگاہ نہیں رکھتے۔" (ایضاً۔ صفحہ ۱۴۰-۱۴۱)

دینی مدارس کو عملی مسائل سے الگ رکھا جاتا ہے

پھر ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۰ء میں جدید تعلیم کے نقائص بیان کرنے کے بعد درس نظامی کی درسگاہوں کی یوں خبر لیتے ہیں:-

"بعینہٖ اس طرح دینی مدارس میں آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ دینی علوم کو دنیا کے بڑے بڑے اجتماعی اور عملی مسائل سے بالکل الگ کرکے پڑھایا جاتا ہے اور جو طلباء دین کے لئے زندگیاں وقف کرتے ہیں وہ سائنس' ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، سیاست' معاشیات، حفظانِ صحت اور معلوماتِ عامہ کے لحاظ سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارا مذہبی نظامِ تعلیم ان علوم کو دینیات کے دائرے سے باہر جگہ دیتا ہے۔" (صفحہ ۳۳)

درسِ نظامی کے استاد۔ ذہنی پستی اور طباع کا افلاس

یہ درسِ نظامی کس قسم کے علماء پیدا کر رہا ہے' یہ بھی انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

"پھر ذرا آپ چراغ لیکر وہ مقدس چہرے تو ڈھونڈ کر دکھا دیجئے جو طلباء کو دین کے اسرار سے آگاہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کیا کوئی ایک ادارہ ایسا ہے جس میں اسلامی نظامِ زندگی کی تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا گیا ہو؟ جس ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونیوالا ہے اس میں یہ ذہنوں کی پستی' طباع کا افلاس اور ہمت کی کمزوری کا روشن ثبوت ہے کہ آج بھی ہمارے ائمہ مساجد دعوت دیتے ہیں کہ آؤ تعلیم دین خطرے میں ہے۔ ہمارے مدرسے کی مدد کرو۔ اور پھر بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں اتنا چندہ ملا۔ کیا اس ملک میں قرآن کا نظام قائم ہوگا جس میں آج تک ہمارے ناظمین مدرس دینیات کو اس سے نجات نہ مل سکی کہ وہ دربدر پھر کر تعلیم دین کیلئے چندہ جمع کریں۔" (ترجمان القرآن بابت جولائی تا ستمبر صفحہ ۲۸۹/۲۲۵)

شاید کسی کے ذہن میں یہ بات ہو کہ کیا دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسے علماء ساز ادارے بھی اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اسکا جواب بھی امیر جماعتِ اسلامی ہی کی زبانی سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور عام جمود "اور اسی طرح ملک کے جس حصے میں بھی کوئی مدرسہ قائم ہوا عام جمود اور مسائل حیات سے فرار کی پالیسی میں اس کی روش دیوبند کے نقشِ قدم پر رہی ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۴۴)

ندوۃ العلماء اور جامعہ ازہر کو بھی درسِ نظامی پر کوئی فوقیت نہیں درسِ نظامی کی اصلاح کے لئے "ندوۃ العلماء" کا دارالعلوم قائم کیا گیا لیکن وہ بھی ان کے ہاں سے شرفِ قبولیت حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی انجمن اتحادِ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آپکی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان کے ہاں علم محض علومِ اوائل کے پڑھانے تک محدود ہے۔ "ندوۃ" اور "ازہر" نے اصلاح کیطرف قدم بڑھایا مگر اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ بصر اور فواد جبر بھی معطل کے معطل ہی ہیں۔ اس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ گھٹیا قسم کے نرے بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔" (تعلیمات۔ صلے)

درسِ نظامی کے مقابلے میں مولانا مودودی کا مثالی علم قدرتاً تقاضا ہے اس بات کی منتظر ہوتی کہ اگر یہ سب نظامہائے تعلیم اس حد تک خراب ہو چکے ہیں تو مثالی تعلیم کا نمونہ کیا ہو سکتا ہے۔ اسے خود مودودی صاحب کی عملی زندگی میں ملاحظہ فرمائیے۔ جماعت اسلامی کیطرف سے علماء کے مقابلے میں ان کی یہ تصویر ہمارے سامنے لائی جاتی ہے۔

"مولانا مودودی صاحب کوئی اکیڈمک طرز کے مصنف نہیں ہیں کہ انہوں نے مجرد علمی خدمت کے لئے زندگی سے غیر متعلق مسائل پر خامہ فرسائی کی ہو۔ وہ کوئی ناقل قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ایک خاص مسلک کی عربی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو اپنے الفاظ میں اردو میں منتقل کر دیتے ہوں۔ وہ کوئی جامد اور مقلد قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ انکا سارا تصنیفی کارنامہ مکھی پر مکھی مار دینا ہو۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کے وہم میں بھی مبتلا نہیں کہ انکا سارا زورِ قلم "غسل و وضو" کے مسائل تک محدود ہو۔ وہ ایک داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں دعوت اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے دین کی متعدد ایسی حقیقتوں کو برملا آشکارا کیا ہے جو اگرچہ دین کی نہایت ثابت و معروف حقیقتیں رہی ہیں لیکن اس دورِ زوال میں ان کو اس وضاحت سے بیان کرنے کی ہمت لوگ کھو بیٹھے تھے۔ اس اصلاح کے مقصد کیخاطر ان کو صرف مسلمانوں کے گمراہ فرقوں ہی پر نہیں بلکہ ان نیکی گروہوں پر بھی تنقید یں کرنی پڑی ہیں جو صحیح بنیاد پر ہونے کے باوجود بہت سی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اس مقصد کے لئے انہیں ان لوگوں سے بھی لڑنا پڑا ہے جو بے جا تعصبات اور تقلید جامد کی بندشوں میں گرفتار ہیں۔ انہیں دین کے صحیح تصور اور اس کے نظام کے احیاء کی خاطر ان لوگوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی ہے جو موجودہ معاشرے کی قیادت کر رہے ہیں۔ الغرض انہوں نے جب سے قرطاس و قلم کا مشغلہ اختیار کیا ان کو اپنے گرد و پیش سے ایک چومکھیا لڑائی لڑنی پڑی ہے۔ حنفی اور اہلحدیث، بریلوی اور دیوبندی، صوفی اور ملا، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور قادیانی منکر حدیث اور منکر شریعت، نیشنلسٹ اور کمیونسٹ کانگریسی اور مسلم لیگی غرض کوئی ایسا نہیں ہے جس پر ان کو تنقید نہ کرنی پڑی ہو اور وہ ان کے لٹریچر کے کسی نہ کسی حصہ سے بیزار نہ ہو۔" (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۳۰/۵۸)

مسخ شدہ مذہبیت

یہی وجہ تو ہے کہ وہ قدم قدم پر امت مسلمہ کی "رہنمائی" کا فریضہ اکیلے سرانجام دے رہے ہیں کیونکہ درس نظامی تو مسخ شدہ مذہبیت ہی کو رواج دے سکا جس نے اسلامی شریعت کو منجمد شاستر بنا دیا ہے۔ چنانچہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں اس مسخ شدہ مذہبیت کے نقائص گناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کو منجمد شاستر بنا دیا ہے

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدر شناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی تعمیر کے لئے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔"

جزئیات کی ناپ تول

"تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول مقداروں کے غیر منصوص تعین اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدار دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس موج میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں۔ اسلام کے راستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مگر یہ اسلام کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے اس نظام تعلیم کو بدل دیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔"

(مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ صفحہ ۱۸۶-۱۸۷)

مقداروں کا غیر منصوص تعین

یہ جو بار بار چھوٹی چھوٹی چیزیں، جزئیات کا ناپ تول، مقداروں کا

غیر منصوص تعین اور روح سے بڑھ کر مظاہر دین کو اہمیت دینے کی اصطلاحات بار بار استعمال ہو رہی ہیں تو ہم اس کی وضاحت کے لئے اس خاص مسئلہ کو سامنے لاتے ہیں جس کی وجہ سے جماعتِ اسلامی کے امیر کو بار بار یہ الفاظ کہنے پڑ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ تھا ڈاڑھی کی منصوص مقدار کا جس پر امیر جماعتِ اسلامی اور جماعت میں داخل ہونے والے دوسرے علماء کے درمیان بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں۔ اس عملی مثال کے سامنے آجانے کے بعد قارئین بھی ان اصطلاحات کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ جائینگے۔

داڑھی سنّت نہیں بلکہ عادت ہے

ایک وقت تھا جب مودودی صاحب خود ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ رئیس احمد صاحب جعفری ندوی (مرحوم) نے اس کی جھلک ہمیں اپنی کتاب "دید و شنید" میں یوں دکھائی ہے۔

"۱۹۳۷ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی۔ میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علیگڈھ کٹ پائجامہ، حیدرآباد وضع کی شیروانی۔ ڈاڑھی ندارد، غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئیں۔ انگریزی تراش کے بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے۔ میں نے مولانا عرفان سے پوچھا۔ آپ کی تعریف۔ فرمایا۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یعنی جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھنے کے بعد مودودی صاحب نے کچھ ڈاڑھی بڑھالی۔ علماء کے اعتراضات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی مقدار اتنی ہی تھی جتنی عام طور پر جماعت اسلامی کے لوگوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ یعنی دور سے دیکھنے سے ڈاڑھی معلوم ہو چاہے اس کی مقدار انچ کا آٹھواں حصہ ہی کیوں نہ ہو۔ علماء نے ان کی اس روش پر سخت اعتراض کیا لیکن مودودی صاحب کا فرمان تھا کہ شریعت سے یہی کچھ ثابت ہوتا ہے۔ اور علماء جو مشت بھر ڈاڑھی کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ مقدار غیر منصوص ہے۔ اور پھر جو لوگ، ان کی تحقیق کے مطابق، اس غیر منصوص مقدار پر زور دیتے ہیں اُسے مودودی صاحب بدعت اور تحریفِ دین قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب کے جواب سے پہلے جماعتِ اسلامی سے متعلق کسی صاحب کی وہ گزارش ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے انکی خدمت میں کی تھی۔

داڑھی بڑھانے کی گزارش

"دوسری گزارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحتِ شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہرِ سنن کی تغیر و تبدیل پر ابتداً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرزِ اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش و تنفر پیدا ہو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قتل منافقین اور تغیر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اعفاء اور تقصیر لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو طرزِ عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادھر مقدار قبضہ تک اعفاء کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر کیا یہ مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لئے آپ بھی اسی جواز پر عمل کر لیں۔

کیونکہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے اس کی اصلاح بنیادی امور اور مہماتِ مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ جماعتِ اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ غور فرمائینگے۔" (ترجمان القرآن۔ بابت مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۲۶۹/۱۷۳)

ڈاڑھی کی مقدار کو منصوص قرار دینا بدعت اور تحریفِ دین ہے

مودودی صاحب نے اس گزارش کا جو جواب دیا اب وہ ملاحظہ فرمائیں:-

"ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے اسکے متعلق یہ گزارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک کی نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے۔ اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریفِ دین کی موجب ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دیدی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کہ منصوص چیز پر ہونا چاہیئے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کے لئے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ درآں حالیکہ جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اسکے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ تحریف جو دین میں کیجا رہی ہے اگر میں اسکے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع و قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میرے نزدیک میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہونگا جس کیلئے اللہ کے یہاں مجھ سے سخت باز پرس ہوگی۔ اور اس باز پرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اسکے کہ اپنے آپ کو اس اُخروی خطرے میں ڈالوں۔" (ترجمان القرآن۔ ایضاً صفحہ ۲۷۱/۱۷۵)

ڈاڑھی عادت تھی اور سنت اور عادت میں فرق

ترجمان القرآن کے اسی شمارہ میں ایک اور عالمِ دین کو عادت اور سنت کا فرق یوں سمجھاتے ہیں:-

"میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے اس کی بنا پر میرا یہ فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے بلکہ اپنے عمل سے ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انہوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے۔ میں اُسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ

اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنت رسولؐ یا اسوۂ رسولؐ ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسولؐ کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر انکے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔" (ایضاً۔ صفحہ ۲۷۴-۲۷۶)

جماعت اسلامی کی دعوت سے لاپرواہی

ظاہر ہے کہ جن علماء کی اس قدر مخالفت کی جائے اور ان کی تنقیص و تحقیر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے، وہ جماعت اسلامی کی تائید کس طرح کر سکتے تھے۔ جماعت اسلامی کے متعلقین کو علماء کی طرف سے جماعت کی مخالفت کا احساس پریشان کر رہا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے مودودی صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ ہماری دعوت، خالص اسلامی ہونے کے باوجود اسلام اپنے حلقوں میں کیوں مقبول نہیں ہو رہی۔ مودودی صاحب نے اس کا ذمہ دار علماء کو قرار دیا۔ فرماتے ہیں :-

"رہے علماء تو ان کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ یہی حضرات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو ان کی موجودہ حالت تک رہنمائی کی ہے۔ یہ بیمار انہی کی لائی ہوئی ہے۔ دینداری اور تقویٰ، اسلام اور ایمان، توحید اور رسالت کا موجودہ مفہوم جو عوام کے ذہنوں میں راسخ ہے انہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھے ہیں کہ یہ انہی کا کام تھا کہ تمام آفات و مصائب کے اندر سے وہ اسلام کو بچا لائے اور آج بھی اس کو بچائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے جو اتنی ہیچ در ہیچ خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں، آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ آج وہ کھلے دل سے اس بات کا اقرار کریں گے کہ آج تک انہوں نے جو رہنمائی کی ہے وہ غلط ہے اور صحیح راہ وہ ہے جس کی دعوت فلاں جماعت دے رہی ہے۔ بلاشبہ حق پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ اس صاف حقیقت کے اقرار سے ان کو شرم نہ آئے ...... لیکن جو حضرات اپنی غلطیوں کو دین و تقویٰ بنا کر ان کی پرستش کرتے اور کرتے رہتے ہیں ان کے لئے اپنے محبوب بتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی تو وہ جہاد اکبر ہے جس کے اہل بہت کم نکلتے ہیں۔ اور اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کمزوری میں ہمارے علماء بھی مبتلا ہیں"۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۸۵-۸۹)

علماء دعوت دین سمجھنے سے قاصر ہیں

پھر اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دیتے ہیں کہ علماء بیچارے تو ہماری دعوت اسلامی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سنیئے :-

"جدید تعلیم یافتہ طبقے کے سنجیدہ اور سلیم الطبع لوگ بہت تیزی سے ہماری دعوت اور جماعت کی طرف متوجہ

ہو رہے ہیں اور ان میں سے جتنے لوگ بھی اب تک نکلے ہیں وہ بہت پختہ اور کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ عربی درسگاہوں کے لوگ بھی اگرچہ اب ہماری طرف توجہ کرنے لگے ہیں لیکن ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی عقیدت میں پھنسی ہوئی ہے اور ہر بات کو برحق تسلیم کر لینے کے باوجود کسی حضرت صاحب میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ یہ جہاں بھی میں نے اس ایک سال کے تنظیمی کام میں محسوس کی ہے کہ جس قدر جلدی اور آسانی سے یہ دعوت ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی کو جو طاغوتی نظام کے چکر میں پھنس کر بالکل چکرا نہ گیا ہو اپیل کرتی ہے اور اپنا اثر جذب کر لیتی ہے، اس سے کئی گنا زیادہ دشواری عربی خوان حضرات کو اسے محض سمجھانے میں پیش آتی ہے۔ بلکہ ہمارے بعض دوستوں کو تو یہاں تک تجربہ ہوا ہے کہ دیہاتی کانوں کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا گیا اور وہ فوراً ہی اسکے انتہائی مقتضیات اور مطالبات کو پا گئے۔ لیکن اچھے اچھے ذی علم اصحاب قال اقول کے چکر ہی میں پڑے رہے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عربی خوان بھائی ایک تو براہ راست قرآن و حدیث سے دین اخذ کرنے کے بجائے بعض مخصوص رجال سے اپنا دین لینے کے خوگر بنا دیئے گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساری کی ساری گروہی عصبیتوں اور مخفی عقیدتوں کو عین تقاضائے دینداری بنا کر اس طرح ان کے ذہن نشین کر دیا جاتا ہے کہ اسکے بعد وہ اپنے حلقے سے باہر کسی دینداری کے قائل ہی نہیں رہتے۔" (ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۱۵/۱۹ - ۱۱۶/۲۰)

سجادہ نشین اور بھڑوں کے چھتے

جماعت اسلامی سے بعض متعلقین نے یہ سوچا کہ عوام کو جماعت کے قریب لانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سجادہ نشینوں اور پیروں کو اپنی تحریک کا ہمنوا بنایا جائے چنانچہ جماعت کے ایک اجتماع میں یہ تحریک پیش کی گئی کہ

تجویز نمبر ۱۵: "سجادہ نشینوں اور پیروں کو اس تحریک کیطرف دعوت دینے کے لئے کوئی خاص قدم اٹھایا جائے کیونکہ ان میں سے کسی ایک شخص کی شرکت کئی ہزار آدمی کی شرکت کے ہم معنی ہے؟"

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

امیر جماعت اسلامی کا فیصلہ

"اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں یہ طبقہ بہت زیادہ بااثر ہے اور لاکھوں کروڑوں آدمی اس سے وابستہ ہیں لیکن ان میں بہت کم آدمی ایسے ہیں جو واقعی صاحب خبر، خدا ترس اور حق پسند ہیں۔ اکثریت اس طبقے میں ایسے لوگوں کی ہے جن سے زیادہ خدا سے پھرے ہوئے لوگ غالباً دنیا میں نہیں ملینگے۔ انہوں نے حق کے لئے صرف اپنے ہی کان نہیں بند کر رکھے ہیں، بلکہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کے کانوں اور دلوں پر مہریں لگا رکھی ہیں۔ انہیں دعوت دینے کا فائدہ یہ تو نہ ہوگا کہ وہ حق کی آواز پر لبیک کہیں گے اور نیم خدائی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائینگے۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ ہم بھڑوں کے چھتے میں خود پتھر پھینک پھینک کر ان کو کاٹنے پر اکسائینگے۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۱۶/۲۰)

عید میلاد اور دوسرے مذہبی جلسے

یہ واضح ہے کہ پیر پرستی بیشتر بریلوی حضرات کا مسلک ہے۔ علاوہ بریں' یہ حضرات عید میلاد، محفلِ قرأت، اور دوسرے انہی قسم کے مذہبی جلسوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ جماعت کے ایک صاحب نے مودودی صاحب سے ایسے جلسوں میں شرکت کی بابت دریافت کیا تو آپ نے یہ جواب دیا۔

"میرے نزدیک میلاد یا سیرت کے یہ جلسے جو ربیع الاول کے موسم میں ہوتے ہیں، مسلمانوں کے ان تفریحی مشاغل میں شامل ہو گئے ہیں جن سے مقصود بجز اپنے نفس کو یہ فریب دینے کے اور کچھ نہیں ہے کہ خدا کا اور رسول کا جو حق ہے وہ اسے بس اس طرح ادا کئے دے رہے ہیں اور ایسی ہی ذہنیت ان کے دوسرے مذہبی جلسوں کی بھی ہو کر رہ گئی ہے اسلئے میں اس قسم کے جلسوں میں شرکت کو نہ صرف یہ کہ غیر مفید سمجھتا ہوں بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہم مسلمانوں کی اس پرانی بیماری کو قوت پہنچانے کے مجرم نہ ہو جائیں۔" (ترجمان القرآن۔ جنوری، فروری ۱۹۴۵ء صفحہ ۹۱)

مجالسِ قرأت اور سرکس کے کھلاڑی

مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) مکہ شریف میں ایک مجلسِ قرأت کے متعلق فرماتے ہیں۔

"تلاوت کرنیوالے صاحب تلاوت نہیں کر رہے بلکہ کرتب اور فن دکھا رہے ہیں' ایک ایک آیت کو پانچ پانچ چھ چھ طریقوں سے پڑھنا، فن دانی کے اظہار کے لئے مناسب ہو تو ہو لیکن تذکیر و ہدایت کے لئے جو کتاب اتاری گئی تھی اس کے ساتھ ہمارے قراء کا یہ سرکس کے کھلاڑیوں کا سا برتاؤ حد درجہ افسوسناک ہے۔ راقم کو اس منظر سے سخت اذیت پہنچی۔" (دیارِ عرب میں چند ماہ۔ صفحہ ۲۴۴)

مسلمانوں کی دینی بیماریوں کا علاج

علماء کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمان جن دینی بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں اور جن کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گذر چکی ہیں' مودودی صاحب کے نزدیک ان کا ایک بڑا علاج "تقلید" کا ختم کرنا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے ان کا مندرجہ ذیل فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔

تقلید گناہ سے شدید تر ہے

"میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر ہے۔" (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۴۴)

ان کے اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ تھا کہ ہمارے علماء جو حنفی ائمہ کی تقلید میں حنفی فقہ کی معتبر کتابوں مثلاً ہدایہ اور عالمگیری وغیرہ کے حوالے دیتے تھے وہ سب مولانا مودودی کی نظر میں دقیانوسی ہو جائیں۔

حنفی فقہ کی کتابیں

چنانچہ ان کتابوں کے بارے میں بھی یہ تصریح انہوں نے خود ہی فرما دی۔

"میں اس بات کا بھی سخت مخالف ہوں کہ علماء کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں۔ اور

اس امر کو بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانہ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئی سائنٹیفک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں۔ اس دور میں روز روز نئے مسائل کا پیدا ہونا لابد ہے اور ان مسائل کو ہدایہ اور بدائع کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں جس کا خطرہ نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں کیا ہے۔ رہنمائی کے لئے علماء اسلام میں وسعتِ نظر اور روحِ اجتہاد کی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لاکر سدِّ راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانے کا مسلمان قرآن وحدیث کو پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے گا چل نکلے گا جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے۔" (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۳۸ء)

اسی سلسلہ میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔

ہدایہ اور عالمگیری قیامت کے دن پناہ نہیں دینگے

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئینگے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم وعقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسلئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا۔ تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس بازپرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالمِ دین کو کنزالدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔"

(حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۹۸)

علماء کیخلاف نفرت وحقارت فطری حد کے اندر ہے!

علماء کیخلاف اتنی سخت مہم چلائی جائے تو اس کا نتیجہ لازمی ہے کہ عامۃ الناس اور خاص کر جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات کے دلوں میں طبقہ علماء کیخلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا۔ تاہم جماعتِ اسلامی کے بعض حضرات نے محسوس کیا کہ جماعت کے لوگوں میں علماء کے خلاف جو نفرت وحقارت پیدا ہوگئی ہے وہ جماعت کے لئے نقصان دِہ ثابت ہوگی۔ اور اسکے سدِّباب کے لئے انہوں نے امیر جماعتِ اسلامی مولانا مودودی سے گزارش کیا۔ یہ گزارش اور امیر جماعت اسلامی کا جواب ہم ان کے رسالہ ترجمان القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

سوال :۔ میں نے اجتماع کے موقعہ پر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقاء میں علمائے اسلام کے خلاف

نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ کہیں تعصب اور تحزب میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسے کہ پہلے بھی متعدد تحریکیں صحیح خطوط پر چل کر آخر کار فرقہ بندی پر جا ختم ہوئیں۔ اس فتنہ کا ہر وقت سدباب ہونا چاہیئے۔ علماء اپنے رویہ میں ایک حد تک معذور ہیں کیونکہ انہوں نے ایک خاص ماحول میں دماغی تربیت پائی ہے اور خاص طرزِ فکر سے وہ مسائل کو سوچنے کے عادی ہیں۔ ہمیں ان کی اس معذوری کا لحاظ رکھنا چاہیئے "

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

مولانا مودودی صاحب کا جواب

"علماء کے متعلق جس رویّہ کی شکایت آپ نے کی ہے وہ یقیناً ایک حد تک پایا جاتا ہے اور میں خود بھی اس کو محسوس کرتا ہوں۔ لیکن ابھی تک میرے نزدیک وہ فطری حد کے اندر ہے۔ جب دین کے لئے کوئی کام کیا جائے اور وہ بالکل صحیح دینی طرز پر بھی ہو، اعتقادی و عملی حیثیت سے کوئی قباحت بھی اس میں نہ بتائی جا سکے اور کسی لوث یا غرض دنیوی کی نشاندہی بھی اس میں نہ کی گئی ہو اور پھر بھی علماء کی طرف سے اس کا صرف یہی نہیں کہ ساتھ نہ دیا جائے، بلکہ مخالفت کا رویہ اختیار کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پر لوگوں کے رنجیدہ نہ ہونے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے اور لوگ جب رنجیدہ ہوں تو اس کے رنج کا اظہار آخر کس شکل میں ہو۔۔۔۔ آپ خود چونکہ علماء کے اس گروہ سے وابستگی رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ عقیدت مندی کی لگاوٹ بھی ابھی تک لگی ہوئی ہے۔ اس لئے ان حضرات کی غلط روش پر جن لوگوں کو رنج ہے انکے رنج پر تو آپ کو شکایت ہے لیکن خود اس غلط روش پر آپ ان حضرات کو ایک حد تک معذور پاتے ہیں۔ کاش زمانہ

علماء غلط کار ہیں

کے سینہ میں بھی آپ کا سا دل ہوتا کہ وہ بھی اس قسم کی معذوریوں کا لحاظ کر کے کسی کے ساتھ رحم کرنے پر تیار ہو جاتا۔ لیکن آپ یقین رکھیئے کہ آپ کے دل میں غلط کاروں کے لئے خواہ کتنے ہی نرم گوشے ہوں، زمانہ ایسے نرم گوشے اپنے سینے میں نہیں رکھتا۔" (ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۲۶۸/۱۷۲)

اس نفرت اور حقارت کے خلاف علماء کا ردعمل

جماعت کیطرف سے علماء کے متعلق جو اس قدر نفرت اور حقارت پیدا کی گئی اور اس کا تدارک کرنے کی بجائے الٹا امیر جماعت نے اُسے شہ دی تو اس کا ردعمل ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے علماء دین اور مفتیانِ شرعِ متین سے خود مودودی صاحب کے مسلک کے متعلق فتاویٰ طلب کئے۔ چنانچہ اس بارے میں مفتی کفایت اللہ سے جو فتویٰ حاصل کیا گیا وہ فتویٰ اور مولانا مودودی صاحب کیطرف سے اس کا جو الزامی جواب دیا گیا تھا، قارئین کے پیش خدمت ہے۔

سوال:۔ یہاں سے فتویٰ دریافت کرنے کے لئے مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم دہلی کے

پاس روانہ کیا گیا تھا کہ مولانا مولوی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اتباع جائز ہے یا ناجائز۔ جواب وہاں سے یہ آیا کہ مولانا مولوی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کسی بھی امام کے قائل نہیں ہیں۔ آزاد خیال آدمی ہیں۔ اس لئے ان کا اتباع شرعاً ناجائز ہے۔ اسلئے آپ سے استدعا ہے کہ آپ اپنے خیال کا اظہار فرمائیں۔

مولانا مودودی صاحب کا الزامی جواب

"میں حیران ہوں کہ جن لوگوں نے مولانا کفایت اللہ صاحب سے یہ سوال کیا تھا انہوں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہی مولانا کفایت اللہ صاحب تیس سال سے گاندھی اور نہرو کا اتباع کر رہے ہیں اور آج بھی انہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے، کہ مسلمانوں کو کانگریس کے حق میں ووٹ دینا چاہیئے۔ کیا کانگریس کسی امام کی قائل ہے؟ بلکہ کیا کانگریس خدا اور رسول کو بھی مانتی ہے؟ پھر جو عالم دین کانگریس کے معاملہ میں تو اماموں کے ماننے یا نہ ماننے کا لحاظ نہ کرے مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اسے امام یاد آنے لگیں۔ کیا وہ اس قابل بھی ہے کہ اس کے فتویٰ کا لحاظ کیا جائے؟

(ترجمان القرآن۔ اپریل و مئی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۱۹/۱۱۹)

مفتی کفایت اللہ کے فتوے کیخلاف پیش بندی

مفتی کفایت اللہ کا فتویٰ شائع ہونے کے بعد علماء میں اس کا خوب خوب تذکرہ ہونے لگا اسلئے اس بات کا امکان تھا کہ شاید جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اس سے متاثر نہ ہو جائیں۔ انہی دنوں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجتماع بھی ہو رہا تھا جس میں شاید مفتی صاحب کے فتویٰ کے اثرات کی پیش بندی کے طور پر جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ سے یہ فیصلہ کرا لیا گیا۔

"خالص شرعی امور میں جن کا تعلق اجتہاد یا تعبیر نصوص سے ہو مجلس شوریٰ بالعموم امیر کی رائے قبول کرے گی۔"

(ترجمان القرآن۔ جون۔ جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۹۴/۶۶)

علماء کے فتاویٰ کی بھرمار

ایک دفعہ اگر علماء کے کسی طبقہ سے فتویٰ کی ابتداء ہو جائے تو پھر اس سیلاب کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ علماء کے ہر طبقہ کی جانب سے جماعت اسلامی کے خلاف فتاویٰ شائع ہونے شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام فتاویٰ کا نقل کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی خوشگوار چیز نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب نے ان تمام فتاویٰ کا جو مشترکہ جواب دیا۔ اس کا پیش کر دینا ہی کافی ہوگا۔

علمائے دیوبند، سہارنپور، دہلی اور تھانہ بھون کے فتاوے

"میں نے ان سب فتووں کو بغور پڑھ لیا ہے۔ یہ کسی جواب کے لائق نہیں ہیں۔ صرف اس لائق ہیں کہ انہیں اٹھا کر رکھ لیا جائے اور اس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ

ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ نفتووں میں مجھے اپنی کسی غلطی کا نشان مل جائے جو واقعی میں نے کی ہو اور ان حضرات نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دی ہو۔ ایسی کوئی چیز ملتی تو میں یقیناً اس کا جواب دینے کے بجائے مان لیتا اور اپنی اصلاح کر لیتا...... آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم ان غلط بیانیوں اور تحریفات کا پردہ کیوں نہیں چاک کر دیتے جو دعوت الی الخیر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ میں عرض کرونگا کہ اگر کوئی ایک فتویٰ یا ایک اشتہار ہوتا تو شاید میں بادلِ نخواستہ اس کی غلطیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کر گزرتا۔ اگرچہ ایسی چیزوں کی طرف توجہ کرنا میرے لئے سخت کراہت کا

شیطان کی فصل

موجب ہے لیکن یہاں تو پاکستان سے ہندوستان تک ہر طرف فتووں، مفلٹوں، اشتہاروں اور مضامین کی ایک فصل اُگ رہی ہے جس میں کیمونسٹ، سوشلسٹ، فرنگیت زدہ ملحد قادیانی، منکرینِ حدیث، اہلِ حدیث، بریلوی اور دیوبندی، سب ہی اپنے اپنے شگوفے چھوڑ رہے ہیں اور آئے دن نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اس فصل کو آخر کون کاٹ سکتا ہے اور کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔ مجھے اگر دنیا میں اور کوئی کام نہ کرنا ہو تو میں اسے کاٹنے پر اپنی عمر کھپاؤں اور جماعتِ اسلامی اگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دستبردار ہو جائے تو اس پر اپنی محنت ضائع کرے۔ ہمارے مخالفین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس

علماء اور جھاڑ جھنکار

حماقت میں مبتلا ہوں اور جھاڑ جھنکار سے الجھ جائیں تاکہ فساق و فجار کی قیادت کو اپنا کام کرنے کے لئے صاف راستہ مل جائے۔ لیکن ہم نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ شیطان کی فصل ہے۔ وہی اسے کاٹے گا۔ خود نہ کاٹے گا تو سنۃ اللہ یہی ہے کہ بالآخر اس کو خود ہی اسے کاٹنا پڑے گا" (ترجمان القرآن۔ مارچ تا مئی ۱۹۵۱ء صفحہ $\frac{۲۱}{۱۴۸}$، $\frac{۲۱}{۱۴۹}$)

کچھ اور فتاویٰ کا جواب

اگرچہ مولانا مودودی صاحب فرما تو یہ رہے ہیں کہ اُن کے لئے ان فتاویٰ کا جواب دینا موجب کراہت ہے لیکن اس کے باوجود اس دوران میں جماعت اسلامی کا کوئی رسالہ یا اخبار اٹھا کر دیکھئے اس میں سب سے نمایاں بحث یہی ہوگی۔ خود ترجمان القرآن کے کئی پرچوں میں یہ سلسلہ جاری رہا چنانچہ ایک صاحب نے کچھ مزید فتاویٰ انہیں ارسال کئے تو انہوں نے علماء پر طنز کے یہ تیر چلائے۔

علماء اور بے دین قیادت کا گٹھ جوڑ

"آپ کے عنایت نامے سے اُن اسباب کا سراغ ملا جن کی وجہ سے دیوبند اور سہارنپور سے لے کر مدرسہ امینیہ تک میں یکایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے.... حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی اکثریت یا تو قلتِ فہم کے باعث یا کم ہمتی کے سبب سے یا پھر اپنی نااہلی کے اندرونی احساس کی وجہ سے دین و دنیا کی تقسیم پر راضی ہو چکی ہے۔ جس کا تخیل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا..... اس تقسیم کو قبول کر

لینے کے بعد یہ حضرات اپنی تمام تر قوت دو باتوں پر صرف کرتے رہے۔ ایک اپنی محدود مذہبی ریاست کی حفاظت جس کے مسائل اور معاملات میں کسی کی مداخلت انہیں گوارا نہیں ہے۔ دوسرے کسی ایسی بے دین قیادت سے گٹھ جوڑ جو مذہب کے محدود دائرے میں ان کی اجارہ داری کی بقا کی ضمانت دے اور اس دائرے سے باہر کی دنیا پر جس فسق و فجور اور جس ضلالت کو چاہے فروغ دیتی رہے۔ اس طرح کی ضمانت اگر کسی قیادت سے انہیں مل جائے تو یہ دل کھول کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور خود جا(؟) لڑا کر اسے قائم کرنے میں دریغ نہیں کرتے، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ کفر و الحاد و فسق و ضلالت تمام سیاسی معاشی اور تہذیبی قوتوں پر قابض ہو کر پورے دین کی جڑیں ہلا دے۔" (ترجمان القرآن - مارچ - مئی ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۲۴/۱۵۲، ۲۵/۱۵۳)

مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے فتویٰ کا جواب

ترجمان القرآن کی اس سے اگلی اشاعت میں مودودی صاحب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے فتویٰ کا بڑا مفصل جواب دیتے ہیں جس کا پورے کا پورا نقل کرنا تو ممکن نہیں صرف پہلا پیرا نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"سب سے نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد صاحب کے اس بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے وہ ان کی زبان ہے۔ جسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایان شان سمجھتے ہوں مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حسن ظن رکھتے ہیں کہ یہ زبان ان کے مرتبے سے فروتر نظر آتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ سے اختلاف ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ سخت سے سخت اختلاف ہو سکتے ہیں اور سخت سے سخت اظہار رائے شریفانہ زبان میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ زبان کہ جس سے اختلاف ہوا، اس کے خلاف "ٹٹ پونجیے" کم بخت، بدبخت اور خبیث جیسے رکیک الفاظ استعمال کر ڈالے جائیں ایک مہذب آدمی کے بھی شایانِ شان نہیں ہے کجا کہ ایک ایسا مرد بزرگ اس کو اختیار کرے جو اس برعظیم کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کا مسند نشین ہے اور جس کی طرف ہزارہا آدمی تعلیم دین ہی کے لئے نہیں تزکیہ نفس کے لئے بھی رجوع کرتے ہیں۔ جب قوم کے مقتدا اور مربی و معلم اس طرح کی باتوں پر اتر آئیں تو بعید نہیں کہ ان سے اخلاق و تہذیب کا سبق لینے والے اصاغر آدمیت سے بالکل عاری ہو جائیں اور اس قوم میں نام کو بھی ایک دوسرے کی عزت کا پاس باقی نہ رہ جائے۔ ؎[۱]

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

(ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۶/۱۸۲، ۲۷/۱۸۳)

---

[۱] مودودی صاحب کے چیلے چانٹوں نے (مثلاً) مولانا احمد علی مرحوم کے خلاف جو "مہذب" زبان استعمال کی تھی اسکا نمونہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ مودودی صاحب کا انداز ہی یہ ہے کہ وہ مخالف کے مقابلہ میں خود تو مہذب بنے رہتے ہیں لیکن اپنے حاشیہ برداروں کو شتشکار کر انکے پیچھے لگا دیتے ہیں کہ وہ انہیں جو جی میں آئے کہیں۔ (طلوع اسلام)

ترجمان القرآن میں اس شعر کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ اس کمی کو ہم پورا کئے دیتے ہیں۔

(ترجمہ) اگر گھر کا بزرگ طبلہ بجانے لگ جائے تو پھر اس کی اولاد کو ناچنے پر ملامت نہ کرو۔

فتوے دینے والے علماء سے خط و کتابت کا مشورہ

کسی صاحب نے امیر جماعت اسلامی کو مشورہ دیا کہ جماعت اسلامی اور علماء کے درمیان جو یہ کشمکش چل پڑی ہے اس کو ختم کرنے کے لئے "وہ فتویٰ دینے والے حضرات علی الخصوص حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا محمد طیب صاحب، حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا حافظ عبداللطیف صاحب سے خط و کتابت کر کے انہیں مشورہ دیں کہ اگر میرے متعلق یا جماعت کے متعلق کوئی استفتاء آپ کے سامنے آئے تو جواب دینے سے پہلے آپ مجھ سے اصل حقیقت معلوم کر لیا کریں۔" (ترجمان القرآن۔ بابت مارچ مئی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۵۸)

امیر جماعت اسلامی کا جواب

مودودی صاحب کی طرف سے اس تجویز کا یہ جواب دیا گیا۔

"آپ کے مخلصانہ مشوروں کا بہت شکر گذار ہوں۔ ممکن تھا کہ میں ان مشوروں پر عمل بھی کرتا۔ لیکن اتفاق کی بات کہ آپ کا عنایت نامہ ملنے کے دوسرے ہی روز ایک صاحب نے مجھے مفتی سعید احمد صاحب کا مفصل فتویٰ، جو کشف حقیقت" کے نام سے چھپا ہے، بھیج دیا۔ اور اس کے ساتھ دو تین اور اشتہار بھی بھیجے جن میں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا جمیل احمد تھانوی، مولانا اعزاز علی صاحب اور مفتی مہدی حسن صاحب کے فتاویٰ درج تھے۔ ان تمام فتووں کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی۔ اب یہ حضرات اس مقام سے گزر چکے ہیں جہاں ان کو خطاب کرنا مناسب اور مفید ہو۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب پر ہے کیونکہ میں ۳۲ سال سے ان کا نیاز مند ہوں اور ہمیشہ ان کا احترام[1] کرتا رہا ہوں۔ افسوس کہ انہوں نے جماعتی عصبیت میں آنکھیں بند کر کے یہ فتویٰ تحریر فرمایا۔ یہ بہت برا توشۂ آخرت ہے جو انہوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے ساتھ لیا ہے۔

مفتی کفایت اللہ کا برا توشۂ آخرت

باقی رہے دوسرے حضرات، تو ان کے فتوے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جس وقت یہ فتوے لکھے جا رہے تھے، اس وقت خدا کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا احساس شاید ان کے قریب بھی موجود نہ تھا۔ خصوصاً مفتی سعید احمد صاحب کے فتووں میں تو صریح بددیانتی کی بدترین مثالیں پائی جاتی ہیں جنہیں دیکھ کر گھن آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان حضرات کے ساتھ بڑا

---

[1] اس احترام کی مثال پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے جو کچھ مودودی صاحب نے زمرۂ علماء کے متعلق فرمایا تھا کیا مفتی کفایت اللہ صاحب اس کی زد سے محفوظ رہے تھے؟

فتوے باز وکافر ساز مولوی

حسنِ ظن رکھتا تھا۔ مگر اب ان کے یہ فتوے دیکھ کر تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بریلوی طبقہ کے فتوے باز وکافر ساز مولویوں سے ان کا مقام کچھ بھی اونچا نہیں ہے۔" (ایضاً۔ صفحہ $\frac{31}{59}$)

فتاویٰ کے ان جوابوں کے باوجود امیر جماعتِ اسلامی صاحب یہی فرماتے رہے کہ ہم ان فتاویٰ کا جواب نہیں دینگے۔ حالانکہ جماعتِ اسلامی کے اہلِ قلم نے نظم و نثر میں ان علماء کیخلاف وہ کچھ لکھا کہ توبہ ہی بھلی۔ ہم اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتے تھے لیکن عدم گنجائش اس کی مانع ہے صرف ایک مثال پیش خدمت ہے اور اسے بھی ہم دل پر پتھر رکھ کر نقل کرتے ہیں۔

مولانا احمد علی صاحب (مرحوم) اور جماعت اسلامی

جماعتِ اسلامی کی مخالفت کرنے والوں میں سے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری (مرحوم) بھی تھے۔ دوست اور دشمن ان کے اخلاص اور تقویٰ کے معترف تھے لیکن جماعتِ اسلامی نے انکے خلاف کیا کیا رکیک الفاظ استعمال کئے تھے، اس کا نمونہ جماعتِ اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" نے اپنی ۱۸ر نومبر ۵۸ء کی اشاعت میں یوں پیش کیا تھا۔ (یاد رہے کہ یہ الفاظ مولانا نصر اللہ خان صاحب عزیز مدیر "الیثیا" کے رشحاتِ قلم کے رہینِ منت تھے) سنیئے:۔

"جاہل، بہتان طراز، مفتری، اخلاقی تعلیمات سے بے بہرہ۔ تقویٰ۔ تقدس۔ للّٰہیت اور تقرب الی اللہ کا ڈھونگ رچانیوالے، فریبی، جھوٹے، مذبوحی حرکتیں کرنے والے، علم و اخلاق سے بے تعلق۔ فاسد ذہنیت کے مالک، پیشہ ور دیندار۔ عقل کے اندھے۔ غیر ذمہ دار۔ خدا اور مخلوق کی شرم سے بے بہرہ۔ بے حیا۔ بیوقوف۔ گھناؤنے اور مکروہ اخلاق کے مالک۔ دیوبند کی چراگاہ سے نکلے ہوئے۔ فریبی۔ دجل و کذب کے مالک۔ کفن چور۔ افیونی۔ شوریدہ سر وغیرہ وغیرہ۔"

دیوبند والے جواب دینے سے عاجز آ گئے

چنانچہ جماعت اسلامی کے مختلف اخبارات و رسائل میں نظم و نثر میں جو جوابات دیئے گئے خود دیوبند والے اس کا جواب دینے سے عاجز آ گئے۔ اسکا اعتراف کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کا رسالہ دارالعلوم بابت جون ۱۹۵۲ء رقمطراز ہے۔

"مودودی صاحب کی تحریروں اور دینیات میں انکے خاص طرزِ فکر سے جماعت دیوبند کو اختلاف ہے، اور اس اختلاف کو ہم رسالہ "دارالعلوم" کے کئی مضامین میں کسی قدر تفصیل کیساتھ پیش بھی کر چکے ہیں۔ ان مضامین کے بعد بھی اگر ہمارا یہ اختلاف کسی کی نظر میں تشریح و تفصیل کا محتاج ہو تو وہ دارالعلوم کے ادارہ تصنیف و تالیف کے وہ رسائل دیکھ سکتا ہے جو اس سلسلہ میں حال ہی میں تیار ہوئے ہیں۔ مودودی صاحب کے ہمنوا اخبارات اور رسائل نے ہمارے اس اصولی اور دینی اختلاف کے سلسلہ میں اخباری مضامین کی ایک زبردست مہم شروع کر رکھی ہے۔

ان حضرات کے فکر و عمل کی نبضیں ٹٹولنے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی اچھی تحریک کی کامیابی کے لئے اس کے پس پشت کسی اچھے عقیدے، اچھے دماغ، اچھے کردار اور اچھی تاریخ کی اتنی ضرورت نہیں سمجھتے جتنی تحریربازی، قلمکاری، انشاپردازی اور اصولی مباحث میں بھی زاید سے زاید الفاظ کے استعمال کی خیال کرتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اس فکر کے چیدہ چیدہ حضرات کے پاس بھی الفاظ اور بے معنی الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم نے پہلے دن سے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ ان مضامین کا ہم کوئی جواب نہیں دیں گے جو اصولی حیثیت نہیں رکھتے۔"

علماء اور جماعت اسلامی کے درمیان جو یہ مہم چل رہی تھی تو اسی دوران تبلیغی جماعت کی ایک مشہور و معروف ہستی مولانا منظور نعمانی صاحب نے انہیں "اکرام مسلم" کا خیال رکھنے کا مشورہ دیا تاکہ ان کی چپقلش کہیں زیادہ خطرناک صورت اختیار نہ کر جائے۔ ان کے مشورہ پر تو کیا عمل کیا جاتا، الٹا انہیں اپنی تبلیغی جماعت کے لئے "بدھ مت کے بھکشو" کی پھبتی سننی پڑی۔ چنانچہ اس مشورہ کا جماعت کی طرف سے یہ جواب دیا گیا۔

تبلیغی جماعت اور بدھ مذہب کے بھکشو

"ان کا منشا یہ ہے کہ جو فساق و فجار اور علمبرداران بدعت و ضلالت مسلمانوں کے بھیس بدل کر کام کر رہے ہیں، اول تو ان سب کی تعظیم و تکریم کرو اور ان کے خلاف زبان کھولو ہی نہیں اور اگر اس پر تم صبر نہیں کرسکتے تو ان پر علی الاعلان نکیر نہ کرو، بلکہ ان کی کوٹھیوں پر حاضری دے کر عاجزی و مسکنت کے ساتھ دست بستہ کچھ خدا رسول کی باتیں عرض کر دیا کرو۔ مولانا کی اپنی جماعت کا رویہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ یہی ہے۔ اس نے نہ ہندوستان میں کبھی ان لوگوں کیخلاف آواز اٹھائی جن کی بدولت وہاں بے دینی کا طوفان اُٹھ رہا ہے۔ اور نہ اسے پاکستان میں کبھی یہ توفیق ہوئی کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر یہاں کی قیادت فاسقہ کے خلاف قولاً یا عملاً کچھ کرتی۔ اسی وجہ سے یہ جماعت پاکستان میں بھی حکومت اور حکام کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی ہوئی ہے حتیٰ کہ یہاں کے فرمانرواؤں سے یہ چاہتے ہیں کہ "مذہب" کے لئے اگر کچھ کام کیا جائے تو اسی جماعت کے طریقہ پر کیا چلئے اور اسی وجہ سے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس جماعت کی سرگرمیاں ہندوستان کی حکومت کی نگاہوں میں کبھی نہیں کھٹکیں۔ کیونکہ بودھ مذہب کے بھکشوؤں کی طرح کام کیا جائے تو اس پر چنگیز خانی سلطنت کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

(ترجمان القرآن۔ بابت نومبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۳۹/۴۲)

اس وقت تک جماعت اسلامی کی سیاست زیر نقاب تھی۔ اب ان کی مصلحتوں کا تقاضا ہوا کہ اس نقاب کو چلمن سے بدل دیا جائے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جماعت اسلامی کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ درحقیقت ایک سیاسی جماعت ہے جس نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے تو اس سے انہیں بڑا غصہ آجاتا ہے اور جواب میں

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ اس لئے ہم مذہبی جماعت بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست الگ الگ نہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی سیاست ہے جو دین سے الگ نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ سیاستِ محمدؐ یہ ہے جو دین سے الگ نہیں۔ میکیاولی سیاست تو دین کی نقیض ہے اور جماعتِ اسلامی کی سیاست مذہب کے نقاب میں میکیاولی سیاست ہے۔ دین کی سیاست میں سیاست کے اصول وحیٔ خداوندی پر مبنی ہوتے ہیں جن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر حالت میں غیر متغیر رہتے ہیں۔ ان میں نہ لچک ہوتی ہے نہ مفاہمت کی گنجائش۔ اسکے برعکس' میکیاولی سیاست کے اصول لچکدار ہوتے ہیں جن میں' بہ تقاضائے مصلحت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ جماعتِ اسلامی کی سیاست میں اصول لچکدار ہوتے ہیں' اس وقت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی جب مودودی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں اعلان کیا کہ

حکمتِ عملی کی پالیسی کا اعلان

"یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے کی کن چیزوں کو راستے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کن کن مواقع کے ہتھ لگنے کو مقصد کی اہمیت دینی چاہیئے اور اپنے اصولوں میں کن میں لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔" (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۶ء بحوالہ المنبر ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ)

جماعتِ اسلامی کے ایک کثیر گروہ نے حکمتِ عملی کی اس پالیسی کو ملتِ اسلامیہ سے دھوکا تصور کیا۔ اسلئے

مولانا امین احسن اور دوسرے اہلِ علم کی جماعت سے علیحدگی

ان کے لئے جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ ان علیحدہ ہونے والوں میں.... جماعتِ اسلامی کے مخلص السابقون الاولون کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔

اسکی ضرورت

اس نقابِ برانگندگی کی ضرورت یوں لاحق ہوئی کہ اس جماعت نے ملکی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے' ان کا فیصلہ یہ تھا کہ شریعت کی رُو سے' بطور امیدوار کھڑے ہونا ناجائز ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخابات جیتنے کے لئے عوام کی اکثریت کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اور ہمارے ہاں عوام بہرحال علماء کے زیرِ اثر ہیں۔ اس لئے جماعتِ اسلامی کی "شرعی مصلحت" کا تقاضا ہوا کہ علماء کے متعلق اپنی روش کو بدلا جائے۔ اس کے لئے کیا اقدامات کئے گئے۔ اسے غور سے سنیئے۔

حنفی فقہ کی سربلندی کی کوشش

حنفی فقہ، حنفی کتبِ فقہ اور تقلیدِ ائمہ کے متعلق انکے جو خیالات تھے، ان کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ لیکن حکمتِ عملی کی پالیسی کے بعد مودودی صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش شروع کر دی کہ وہ تو عملاً حنفی فقہ کو اس ملک میں

نافذ کرانے کی جد وجہد کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کر دی کہ پاکستان کا مکمل قانون یہاں کی اکثریت کی تعبیر کے مطابق ہوگا۔ یعنی یہاں فقہ حنفی بطور ملکی قانون نافذ کر دی جائے گی ـــ یہ وہی فقہ ہے جسے مودودی صاحب "منجمد شاستر" کہہ کر پکارتے تھے اور امت کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے تھے۔

عائلی قوانین میں ملک کی تبدیلی

ہمارے ملک میں ۱۹۶۱ء میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے وہ امیر جماعت اسلامی کی کتاب "حقوق الزوجین" کی سفارشات سے ملتے جلتے تھے۔ چونکہ اس میں کئی باتیں حنفی فقہ کے خلاف تھیں اس لئے اس پر اعتراضات بھی ہوئے۔ لیکن انہوں نے اعتراض کرنے والوں کو خوفناک شرعی دھمکی دی۔ لیکن جب یہ قوانین حکومت کی طرف سے نافذ ہوئے تو خود جماعت اسلامی والے ان کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے کہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہیں۔

(عائلی قوانین پر چودہ علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۸)

اتحاد جمعیت العلماء کا قیام

اسی دوران جماعت اسلامی کے ایک سرگرم کارکن کی نگرانی میں جمعیت اتحاد العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جماعت اسلامی کیطرف سے اس ادارہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا کیا کوششیں ہوئیں، ان کی تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں۔ تاہم حال ہی میں جماعت اسلامی کے ایک نقیب ہفتہ وار "ایشیا" کے "اتحاد العلماء" نمبر میں جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں ان کے مطابق کوئی ۲۳۰۰ (دو ہزار تین سو) "علماء حق" اس تنظیم میں شامل ہوئے ہیں جن کی فہرست اس میں شائع کی گئی ہے۔ علماء کی جو یہ کثیر جماعت ان کے زیر اثر آئی ہے، ان کی زیر نگرانی صرف مغربی پاکستان میں درس نظامی کے ۳۷ مدرسے چل رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو "ایشیا" اتحاد العلماء نمبر، ص ۲۷ تا ۳۳)

درس نظامی کے مدارس کے بارے میں جماعت اسلامی کا جو نقطہ نظر ہے وہ پچھلے صفحات میں سامنے لایا جا چکا ہے لیکن حکمت عملی کی پالیسی کے تحت اس بارے میں جو لچک پیدا کی گئی ہے، وہ مدیر ترجمان القرآن کی زبانی سنیئے۔ وہ ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۷ء کے اشارات میں لکھتے ہیں:-

درس نظامی ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرتا ہے

"مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ درس نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں بہتر ہے۔ اس نصاب کو اگر اچھے طریقہ سے پڑھ لیا جائے تو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔" (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۶/۱۹)

اللہ اللہ! وہ نصابِ تعلیم جس میں "آٹے میں نمک برابر دین نہیں تھا" اور جو علماء کی تمام خرابیوں کی جڑ تھا، کس طرح اب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کا واحد نصاب بن گیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے خود، اپنے ایک

جماعت اسلامی کی درسگاہِ درسِ نظامی کا اجراء

"انصاف پسند مفتی" کی زیرِ نگرانی راولپنڈی میں درسِ نظامی کی ایک درسگاہ کا اجراء کر دیا۔ اس کے اجراء کے بعد تو علماء کو یقین ہو جائے گا کہ ان میں اور جماعت اسلامی میں کوئی وجہِ امتیاز باقی نہیں رہی۔

انبیاء کے وارث

یہ مقالہ کافی طویل ہو چکا ہے۔ اس لئے زیادہ تفصیلات سے احتراز کرتے ہوئے ہم صرف ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ حکمتِ عملی کی پالیسی سے پہلے جماعت اسلامی کی طرف سے علماء کو جس نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اس کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔ لیکن حکمتِ عملی کی پالیسی کے بعد انہی لوگوں کو "انبیاء کا وارث" کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ایشیا۔ اتحاد العلماء نمبر) صرف ایشیا کے اسی شمارے میں علماء کی شان میں یہ "حدیث" درجنوں مقامات پر دہرائی گئی ہے اور حد یہ ہے کہ صفحہ ۱۷ پر اس کا حوالہ بخاری شریف کا دیا گیا ہے۔ جماعت اسلامی کا سارا قدیمی لٹریچر دیکھ جائیے، اس میں کہیں بھی علماء کو اس حدیث سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ائمہ حدیث کے نزدیک اس کی حیثیت کیا ہے؟ امام بخاری نے یہ الفاظ ضرور نقل کئے ہیں لیکن اسے اسناد کے بغیر بیان کیا ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں۔ وذکرہ البخاری فی صحیحہ بغیر اسنادٍ۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۲ صفحہ ۱۳۹) علامہ شوکانی نے اس حدیث پر فن حدیث کی روشنی میں پوری بحث فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ اخرجہ احمد و ابوداؤد والترمذی وابن حبان من حدیث ابی الدرداءؓ۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان نے ابو درداء کی روایت سے بیان کیا ہے۔" (ایضاً) اور پھر اس کے ضعیف ہونے کے بارے میں محدثین کا یہ فیصلہ نقل کرتے ہیں۔ وضعفہ الدارقطنی فی العلل۔ دارقطنی نے "العلل" میں ابو درداء کو ضعیف راوی قرار دیا ہے۔ قال المنذری وھو مضطرب الاسناد۔ المنذری کا کہنا ہے کہ وہ مختلف احادیث کی اسناد میں گڑبڑ کرتا تھا۔" (ایضاً)

انکارِ حدیث کی خطرناک صورت

لیکن امیرِ جماعتِ اسلامی کو ائمہ حدیث کی تحقیقات اور فنِ حدیث کی بحثوں سے کیا واسطہ۔ انہوں نے تو ان تمام لاکھوں ائمہ حدیث کی کوششوں کو یک قلم موقوف کر کے، ردّ و قبولِ حدیث کے متعلق اپنے اصول وضع کر لئے ہیں۔ جن کا دار و مدار فنِ حدیث کی باریکیوں کے بجائے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی "مزاج شناسی" پر ہے۔

ان کا یہ "اصول" انہی کی زبانی سنیئے۔

"جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اُسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکارؐ کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی رُوح، روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان استاد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے۔ مگر اس کے فیصلے کا دار و مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف۔ منقطع السند۔ مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلّل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس کے جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔"

(تفہیمات۔ از مولانا مودودی صاحب۔ جلد اول صفحہ ۲۹۶ مضمون مسلک اعتدال)

نبی اکرمؐ کا مزاج شناس

حرفِ آخر

ہم علمائے کرام سے گزارش کریں گے کہ وہ غور فرمائیں کہ انکارِ حدیث کی اس سے زیادہ خطرناک اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کا دار و مدار ایک فرد کا ذاتی فیصلہ قرار پا جائے۔

حکمتِ عملی کی پالیسی کے تحت جماعتِ اسلامی اپنے "اصولوں میں جو لچک" پیدا کر رہی ہے بہت سے مسائل میں وہ ہمارے سامنے ہے۔ علماء کے بارے میں بھی اس نے اپنی اسی پالیسی پر عمل کیا ہے لیکن ان حضرات کو اس سے فریب میں نہیں آ جانا چاہیئے۔ یہ فیصلے تو حکمتِ عملی کے ماتحت، اپنی مصلحتوں کے تقاضوں کی رُو سے کئے جاتے ہیں۔ معلوم کب ان کی مصلحتیں بدل جائیں اور علماء کے متعلق یہ پھر وہی کچھ کہنے لگ جائیں جو کچھ یہ اس سے پہلے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ بے اصولے پن پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

نقد و نظر

(THE WAILING VALE) - وادیٔ گریاں (انگریزی) - از عزیز بیگ۔
طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ جلد مضبوط۔ گرد پوش نظارہ خیز۔ مزین بہ تصاویر۔
شائع کردہ۔ بابر اینڈ عامر پبلیکیشنز۔ (N - 4) گلبرگ۔ انڈسٹریل ایریا۔ لاہور۔ قیمت۔ بیس ۲۰/- روپے۔

مسئلہ کشمیر، پاکستان کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہونے کے باوجود اہلِ پاکستان کی نگاہوں سے اوجھل اور محو ہوتا چلا جا رہا ہے اور یہ ہمارے ملک اور قوم کی بڑی بدقسمتی ہے۔ اگر اسکے حل کے لئے کوئی نتیجہ خیز عملی صورت، ہنوز ممکن نہیں تو کم از کم اتنا ہی ہو کہ اس کے نقوش کو ذہنوں میں دھندلا نہ ہونے دیا جائے اور اس قومی المیہ کی حکایتِ خونچکاں کو اسطرح بار بار دہرایا جائے کہ ہماری آنے والی نسلوں کے دل میں اس کا احساس بیدار رہے۔ عزیز بیگ صاحب کی زیرِ تبصرہ تالیف اس مقصد کے حصول کے لئے ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں اس عبرت انگیز مرقع کو شروع سے اخیر تک، واقعاتی لیکن پُرکشش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عزیز بیگ صاحب کی ایک صحافتی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معلومات کو کاوش و کوشش سے جمع کرتے اور پھر انہیں سلیقہ سے اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ قاری ان کے ساتھ ساتھ چلتے خود بخود نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس میں پیش کردہ معلومات مستند بھی ہیں اور اس قابل بھی کہ انہیں محفوظ رکھا جائے تاکہ آئندہ کام آئیں۔ کتاب کی تصاویر نفسِ مضمون کو اجاگر کرنے میں بڑی مدد دیتی ہیں اور آخر میں تعلیقات، معلومات میں مفید اضافہ کا موجب ہیں۔

(۰)

نظریۂ پاکستان

پاکستان کا نظریہ درحقیقت اسلام کا دوسرا نام ہے۔ چوہدری حبیب احمد صاحب کی اس کتاب میں اس نظریہ (یعنی اسلام) کے بنیادی خط و خال کو اجاگر کر کے دکھایا گیا ہے۔ معلومات افزا۔ بصیرت افروز۔ فکرِ اقبالؒ کی شارح۔ سفید کاغذ۔ مجلد۔ گرد پوش۔ ضخامت ۲۸۴ صفحات۔ (قیمت۔ دس روپے)

ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ نبویہ۔ داتا گنج بخش روڈ۔ لاہور۔ (۲) مکتبہ پاکستان۔ چوک انارکلی۔ لاہور
۳۔ مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

۱۔ لغات القرآن یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے' اس کی تعلیم کیا ہے' اس کی دعوت کیا ہے؟ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے میں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟ یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائیگی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسکی رُو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ چیپ ایڈیشن۔ چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اسکے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز صاحب ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کے جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت۔ حصہ اول' آٹھ روپے۔ حصہ دوم۔ سوم چھ چھ روپے۔

۴۔ نظام ربوبیت نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ لیکن اسکے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت۔ چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے انکا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت قسم اعلیٰ مجلد۔ ۹ روپے، قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶۔ سلسبیل قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۷۔ بہارِ نو یہ مقالات کے مجموعے کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ اسمیں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت۔ پانچ روپے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور